ISSN 0974-7346

دسمبر ۲۰۲۲ء

جلد ۲۰۹ — عدد ۱۲

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان	سالانہ ۳۵۰ روپے۔ فی شمارہ ۳۰ روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴ روپے۔ ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰ روپئے میں دستیاب۔ لائف ممبر شپ ۱۰۰۰۰ روپے ہے۔
دیگر ممالک	رجسٹرڈ ہوائی ڈاک ۲۹۴۰ روپے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔ اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔
بذریعہ ایمیل	اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ایمیل (ساری دنیا میں) ۳۵۰ روپے سالانہ۔

سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔
بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
* معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

Office Mobile: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دار المصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۹ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۴۴ھ مطابق ماہ دسمبر ۲۰۲۲ء عدد ۱۲

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

info@shibliacademy.org

فہرست مضامین

شذرات	محمد عمیر الصدیق ندوی	۸۹۰
مقالات		
طبقات ابن سعد کا مطالعہ	شکیل الرحمن بن اکبر علی	۸۹۳
اسلامی معاشیات کی تشکیل و نظریہ سازی میں علماءِ کرام کا حصہ	پروفیسر عبدالعظیم اصلاحی	۹۰۳
سلاطین دہلی کی مذہبی رواداری	ڈاکٹر عاطف عمران	۹۱۷
''نسیمِ حجاز'' حمدیہ اور نعتیہ شاعری کا گلدستہ	ڈاکٹر امتیاز احمد	۹۳۱
اخبار الاخیار کا ایک اور خاتمۃ الکتاب	ڈاکٹر عارف نوشاہی	۹۳۵
اخبار علمیہ	کلیم صفات اصلاحی	۹۴۰
تلخیص و تبصرہ	کلیم صفات اصلاحی	۹۴۲
تبصرۂ کتب	ع۔ص، ک۔ص اصلاحی	۹۴۵
وفیات	ع۔ص	۹۵۲
ادبیات	وارث ریاضی	۹۵۹
معارف کی ڈاک		۹۶۰
رسید کتب موصولہ		۹۶۸

شذرات

۱۹۴۷ء میں ملک جب انگریزوں کے تسلط واقتدار سے آزاد ہوا تھا اس وقت عوام وخواص دونوں کو امید ہی نہیں یقین تھا کہ اب آئین اپنا ہوگا، قانون اپنا ہوگا، قانون کے نفاذ کے ذمہ دار بھی اپنے ہوں گے، عدل و انصاف اب کسی صاحب اقتدار کی مداخلت بے جا سے بے نیاز ہو کر حق و صداقت اور غیر جانب داری کا عمدہ نمونہ ہوگا، اور سب سے بڑھ کر اس اخلاق و تہذیب اور انسانیت کا دور دورہ ہوگا جس کو ہندوستان کے حافظہ سے مٹانے کی مسلسل کوششیں، انگریزوں کی سرمایہ دارانہ اور تاجرانہ سیاست کی علامت بن گئی تھیں۔ لیکن آزادی کے معاً بعد ہی کچھ دور بیں اور عاقبت اندیش ذہنوں میں کچھ اور ہی منظر تشکیل پا رہے تھے، جن سے یہ ظاہر ہونے لگا تھا کہ اب نئے ہندوستان میں آئین، قانون، عدل، انصاف، مساوات، جمہوریت جیسے الفاظ کی معنویت وہ نہ رہے گی جو اس وقت تک مراد لی جاتی تھی، چند ہی برسوں میں یہ احساس عام ہونے لگا کہ آزادی کے بعد ہندوستان کو جیسے اخلاق و تہذیب اور انسانیت و شرافت سے بھی آزادی مل گئی ہے۔ یہ احساس مسلمانوں کے معاملہ میں بعض متشددین کی زبان و قلم پر عدم احتساب کے سبب پنپ رہا تھا، لیکن وہ دور بہر حال ابتدائی تھا اس لیے اس دور کے عروج اور انتہا کا تصور پوری طرح امیدوں اور تمناؤں سے بالکل بے تعلق بھی نہیں ہوا تھا، اس وقت کسی کا یہ کہنا قابل قبول تو کیا، قابل لحاظ بھی نہیں تھا کہ ”رہا ہندوستان تو وہاں جو کچھ بھی ہندو چاہیں گے کریں گے، خواہ ہم راضی ہوں یا نہ ہوں“ اور یہ تشریح بھی ساٹھ کی دہائی میں کچھ عجیب اور نامانوس سی لگتی تھی کہ سیکولرزم کے معنی اکثریت کی تہذیب کا غلبہ و تسلط ہو گیا اور اقلیت کے حقوق کی پامالی اور قوم پروری کا مفہوم اکثریت کا قول و عمل بن گیا خواہ وہ اسی کے سراسر خلاف کیوں نہ ہو اور فرقہ پرستی کے معنی اقلیت کی آواز کے ہو گئے خواہ وہ حق وصداقت ہی پر مبنی ہو۔

اب آزادی کے پچھتر برس ہونے پر واقعی اپنے بزرگوں کی پیش بینی پر تعجب ہوتا ہے کہ انہوں نے آزاد ہندوستان میں سیاست کے نام پر شروع ہونے والی اخلاق و تہذیب اور شرافت وانسانیت کی بے بسی بلکہ رسوائی کو کس طرح دیکھ لیا تھا۔ ادھر چند برسوں میں ایک تنظیم کے انداز سیاست نے جو گل کھلائے، اس نے برسوں پہلے کے اندیشوں کو اور بھی حقیقت میں بدل دیا، سیاست میں اخلاق کی جو بھی آمیزش بچی تھی وہ بھی دور کر دی گئی، جمہوریت کو فسطائیت میں بدلنے اور اس کے لیے سب سے بڑی اخلاقی برائی جھوٹ کا جس طرح استعمال کیا گیا، اس کے اثرات بدنے معاشرہ میں خصوصاً نئی نسل میں ایک عجب

وحشت اور درندگی اور سفاکی کو جنم دیا شقاوت قلب نے کمال یہ کیا کہ اس میں بھی لذت کا عنصر پیدا کردیا، مذہبی یا نظریاتی طور پر اتفاق نہ کرنا ایسا جرم بن گیا جس کی سزا کا اختیار کچھ لوگوں نے محض اس لیے اپنے نام کرلیا کہ وہ اکثریتی اقتدار کا حصہ ہیں، معصوم اور بے گناہ لوگوں کو برسرعام مار دینے کے واقعات کا ایک اثر یہ ہوا کہ اب ذرا ذرا سی بات پر زیردستوں اور کمزوروں کو قتل کرنے، لاشوں کو ٹکڑوں میں بدلنے کے واقعات عام ہوتے جاتے ہیں، اب قانون کا خوف بھی نہیں رہا، بلکہ خود قانون اس ذہنیت سے خوفزدہ ہونے لگا جو ہر ضابطہ اور قانون سے خود کو بالاتر سمجھتی ہے۔ جمہوریت نے جس احتساب کا حق جمہور کو دیا ،اس کو دھرم اور ثقافت کے شور وشر میں اس طرح غائب کردیا گیا کہ کاروان آزادی کی متاع کب اور کیسے گم ہوگئی، اس زیاں کاری کا احساس بھی نہ رہا کہ بنیادی انسانی اخلاقیات سے عاری حکومت صرف سیاست ہی نہیں معیشت اور معاشرت کی اخلاقیات کی بربادی کی بنیاد رکھ کر پورے ملک کو تباہی کے دہانے پر لاکھڑا کردیتی ہے۔ یہاں یہ آشوب بیانی صرف اس لیے ہے کہ ہم اپنے بزرگوں کی ان باتوں کو پھر سے دیکھنے اور دکھانے کی ہمت کریں جنھوں نے برسوں پہلے نہایت دردمندی سے کہا تھا کہ حکومت چلانے والوں میں اخلاق کی بلندی اور وسعت اور سیرت کی پختگی اور کیریکٹر کی مضبوطی نہیں تو ان میں وجود کی ذاتی صلاحیت اور بقا کی اصلی استعداد کبھی پیدا نہیں ہوگی۔ ہم اکثریت سے کہتے ہیں اور اقلیت سے بھی کہ اپنے ذمہ داروں کا انتخاب، اعلی کردار، شریفانہ سیرت اور بلند اخلاق کی بنیاد پر کرنا چاہیے، ایسوں کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے جن کی نظر میں وسعت، سینہ میں گنجائش اور ہاتھ میں مضبوطی ہو، جن میں صرف اپنی اور اپنے دوستوں کی شکم سیری کا سامان نہ ہو بلکہ عام خلق خدا کا بھی خیال ہو، جن کو صرف اپنے عبادت خانے، دھرم شالے اور تعلیمی ادارے عزیز نہ ہوں بلکہ ملک کے ہر طبقہ کے اداروں کے ساتھ یکساں تعلق ہو، جن کی نظروں میں انسانوں کی جانوں کو بچانا، جانوروں کے بچانے سے زیادہ اہم ہو، اور جو ان باتوں کو صرف حریف اور مقابل کی زبان سے نکلے الفاظ نہ سمجھیں، کہنے والے کے جذبات کی حرارت کو بھی محسوس کریں۔

معارف نے کبھی عملی سیاست کی وادیوں کی سیر نہیں کی، نہ اس بحر کی غواصی سے نئے رموز واسرار کے موتی نکالے، اس نے نشیب وفراز کے پیمانوں سے دور رہ کر البتہ یہ ضرور کیا کہ دل کا درد سامنے رکھ دیا، معارف خصوصاً اس کی شذراتی تحریروں میں یہ درد عام ہے۔ جیسے ایک بار یہ لکھا گیا کہ مذہب اور دین کی حمایت کا نام لے کر عوام کو جوش دلانا اور ان سے اپنا کام نکالنا غلط رہنمائی ہے، مسلم جماعتوں سے خطاب

کر کے کہا گیا کہ اس طرح مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچے گا، ضرورت اس کی ہے کہ مسلمانوں کو ضبط، صبر، تنظیم، استقامت، ایثار اور باہمی ہم دردی، عملی وحدت اور اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دی جائے جو سیاست کی جنگ کے سب سے کار گر ہتھیار ہیں۔ کیا یہ الفاظ آج بھی غور و فکر کی دعوت نہیں دیتے؟

عجب عالم ہے کہ ہر موسم جیسے خزاں کا موسم ہو گیا ہو، ہر مہینے الفاظ کا ایک ذخیرہ صرف ماتم ہو کر رہ گیا ہے، کچھ باکمال اور یادگار زمانہ شخصیتوں کا ذکر حصہ وفیات میں کیا جا چکا تھا، کہ پاکستان سے خبر ملی کہ وہاں کی نہایت مقتدر علمی و مذہبی ہستی مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی نے وفات پائی، وہ ایک علمی خانوادہ میں واقعی رفیع الدرجات تھے۔ مفتی اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع ان کے والد تھے اور نہایت معروف عالم دین مولانا محمد تقی عثمانی کے بھائی تھے، تدریس و تصنیف اور تقریر میں بھی رفعت شان تھی، کراچی کے مشہور دینی و تعلیمی ادارہ دارالعلوم کراچی کے وہ صدر تھے سیرت میں علماء و صلحاء کی تعلیم و عمل کا نمونہ تھے۔ ان کے جنازہ کے مناظر اس دنیا میں ان کی مقبولیت کا ثبوت ہیں، اللہ تعالیٰ آخرت میں بھی اسی مقبولیت سے نوازے۔ آمین۔ ایک اور دلدوز حادثہ میں مدرسۃ الاصلاح کے ممتاز مدرس مولانا ابوالفیض اصلاحی اور ان کے رفیق مولانا خورشید انور نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ عصر کی نماز دارالمصنّفین کی مسجد میں ادا کر کے دونوں حضرات اپنے گاؤں کے لیے روانہ ہوئے، منزل تک پہنچنے میں صرف چند ساعتوں کا فاصلہ تھا کہ ان کی موٹر سائیکل ایک کار سے ٹکرا گئی اور دونوں کے لیے شہادت کا مقام متعین کر گئی۔ مولانا اصلاحی کے ذمہ فقہ کا درس تھا، وہ عمدہ خطیب تھے، ادھر رجوع الی القرآن کی مہم میں وہ بڑے سرگرم تھے، دارالمصنّفین کی مسجد میں بھی ایک خطبہ اسی موضوع پر دو تین ہفتے پہلے دیا تھا۔ مولانا خورشید انور مہاراشٹر میں جماعت اسلامی کے نہایت فعال کارکن تھے، چند دنوں کے لیے اپنے وطن آئے تھے۔ یقین ہے کہ یہ حضرات اللہ تعالیٰ کی رحمت کے سایے میں ہوں گے، دعا یہی ہے کہ پس ماندگان کو صبر کی توفیق ملے۔ آمین۔

***

مقالات

طبقات ابن سعد کا مطالعہ

شکیل الرحمن بن اکبر علی

ریسرچ اسکالر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

shakeelmau7@gmail.com

طبقات ایک ایسا فن ہے جس میں امت کے اچھے اور بھلے لوگوں کے مراتب کی نشاندہی کی جاتی ہے، اور اسی کے پیش نظر طبقات میں لوگوں کے حالات کو مناصب، انساب، عہد اور جگہوں وغیرہ کے اعتبار سے مختلف مراتب میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اصطلاح میں ''طبقات'' کا مطلب ہوتا ہے ایک ایسی جماعت جو عمر اور استاد کے سامنے زانوے تلمذ تہ کرنے میں یا صرف شاگردی میں تقریباً برابر کی شریک ہو۔[1] طبقات کی اصل وبنیاد حدیث نبوی ''خیر الناس قرنی...[2]'' کو مانا جاتا ہے۔

اس فن سے نقد حدیث کا فائدہ ہوتا ہے۔ اس لئے اسے علم روایتِ حدیث کی ایک شاخ مانا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے راویوں کی نشاندہی اور جانچ پڑتال ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ اس سے اسناد کے ارسال وانقطاع کا بھی علم ہوتا ہے۔ چنانچہ ائمہ و محدثین نے اسماء الرجال کے ساتھ طبقات کے میدان میں بھی متعدد کتابیں تالیف کی ہیں۔ ان میں محمد بن عمر الواقدی کی کتاب الطبقات، ہیثم بن عدی الطائی کی طبقات من روی عن النبی من الصحابۃ، اور حسین بن محمد حرانی کی طبقات الحرانیین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سب سے مشہور کتاب محمد بن سعد بصری کی الطبقات الکبریٰ ہے، جو طبقات ابن سعد کے نام سے معروف ہے۔

---

[1] الرویشی، عواد حمید محمد، رواۃ الحدیث : النشاۃ، المصطلحات، المصنفات، دار المیمنۃ للنشر و التوزیع، دمشق، ۱۴۳۹ھ/۲۰۱۸ء، صفحہ ۳۳۲

[2] البخاری، محمد بن اسماعیل، صحیح البخاری، کتاب الشہادات، باب: لا یشهد علی شهادة جَور اذا اشهد، محقق، محمد زہیر بن ناصر النصر، دار طوق النجاۃ، بیروت، ۱۴۲۲ھ، جلد ۳، صفحہ ۱۷۱، حدیث نمبر ۲۶۵۲،

سطور ذیل میں اس کتاب کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن اس سے قبل مؤلف کے حالات پر مختصر روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مختصر حالات زندگی: ان کا اصل نام محمد بن سعد بن منیع ہاشمی، بصری، بغدادی[۳] تھا، لیکن شہرت ''ابن سعد'' کے نام سے ہے۔ اس کے علاوہ علمی حلقوں میں آپ کو ''کاتب الواقدی'' اور ''صاحب الطبقات'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔[۴]

کتب تراجم میں ان کی تاریخ ولادت کے متعلق مختلف اقوال ملتے ہیں۔ امام ذہبی (م:۷۴۸ھ/ ۱۳۴۷ء) کے مطابق ان کی ولادت ۱۶۰ ہجری (۷۷۷ء) کے بعد ہوئی ہے۔ لیکن مشہور ہے کہ ان کی ولادت بصرہ میں ۱۶۸ ہجری (۷۸۵ء) میں ہوئی[۵]۔ یہ دوسرا قول اکثر مؤرخین کے نزدیک مشترک پایا جاتا ہے۔

تذکرہ نگاروں نے ان کی ابتدائی زندگی پر کوئی خاص روشنی نہیں ڈالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی ان کی ابتدائی زندگی اور نشو و نما کے متعلق تفصیلات ہمیں نہیں ملتی ہیں۔ سوائے اس کے کہ ان کی تعلیم کا آغاز ان کے آبائی وطن بصرہ میں ہوا، اور یہاں کے علماء سے استفادہ کے بعد مزید تعلیم کے لئے انہوں نے مختلف علاقوں کا سفر کیا۔ اس کے لئے سب سے پہلے کوفہ گئے۔ وہاں رہ کر ابن المہدی، ابوالولید الطیالسی اور ابو عاصم النبیل جیسے علماء سے استفادہ کیا۔ پھر یہاں سے مکہ و مدینہ ہوتے ہوئے بغداد پہونچے۔ یہیں پر سکونت اختیار کر کے محمد بن عمر الواقدی کے شاگرد بنے۔ اور ان کی وفات کے بعد ان کی مسند علمی کے جانشین بھی بنے۔ الواقدی سے ان کے قلبی لگاؤ اور ان کی کتابوں کو لکھنے کی وجہ سے انہیں ''کاتب الوقدی'' کا لقب ملا۔ ان کا شمار نویں صدی عیسوی کے کبار علماء میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے استاد الواقدی کی طرح متبحر العلم تھے۔ ائمہ جرح و تعدیل نے ان کو کثیر الحدیث راویوں میں شمار

---

[۳] ان کے اجداد میں سے کوئی بنی ہاشم کا غلام تھا جسکی نسبت سے آپ ہاشمی کہلاتے ہیں۔ بعض لوگوں نے زہری یربوعی نسبت بھی بتائی ہے۔

[۴] ذہبی، شمس الدین محمد بن احمد، سیر اعلام النبلا، محقق: جماعت محققین زیر نگرانی شعیب الأرناؤوط، مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء، جلد ۱۰، طبع ثالث، صفحہ ۶۶۴، ترجمہ نمبر ۲۴۲۔

[۵] ماخذ سابق

کیا ہے۔ کتاب وسنت سے والہانہ عقیدت کی وجہ سے عہد مامونی میں فتنہ خلق قرآن کے سبب سخت اذیت سے دوچار ہوئے۔ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تکلیف کی تاب نہ لا کر انہوں نے بظاہر اور زبانی طور پر خلق قرآن کے نظریے کو قبول کر لیا تھا۔ اسماء الرجال کی کتابوں میں انہیں حافظ، علامہ اور حجت جیسے القاب سے نوازا گیا ہے۔ محدثین کرام نے انہیں الواقدی، ہشام بن محمد سائب الکلبی اور ابو معشر سے روایت کی وجہ سے جرح وتنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ لیکن ان تمام امور کے باوجود تاریخ نگاری میں ان کے طرز اسلوب اور علمی صلاحیت کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ الغرض انہوں نے اپنی پوری زندگی اسلام اور اسلامی تاریخ کی نشر واشاعت میں گزار دی اور اپنی مشہور زمانہ کتاب الطبقات الکبری کی نسبت صاحب الطبقات یا ابن سعد کے نام سے جانے گئے۔

ان کے اساتذہ کے ناموں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ ان کا تذکرہ الطبقات الکبری محقق بہ زیاد بن منصور کے مقدمہ نگار ڈاکٹر عبداللہ بن عبداللہ الزاید نے اپنے مقدمے میں مختلف علوم اور مقامات کے اعتبار سے تفصیل سے کیا ہے۔ یہاں پر اجمالاً صرف چند ناموں کو نقل کیا جاتا ہے: سفیان بن عیینہ، امام وکیع، انس بن عیاض اللیثی، محمد بن عمر الواقدی اور ہیثم بن بشیر[۶] وغیرہ۔ ان کے شاگردوں کی تعداد اساتذہ سے کہیں زیادہ ہے، جن میں ابن ابی الدنیا، احمد بن یحیٰ البلاذری، حارث بن ابی اسامہ، حسین بن فہم اور ابوالقاسم البغوی[۷] وغیرہ کا نام بہت اہم اور مشہور ہے۔

عام طور سے ان کا شمار قلیل التصانیف علماء میں ہوتا ہے، لیکن کچھ لوگوں نے ان کے کثیر التصانیف ہونے کا بھی دعوی کیا ہے۔ تذکرہ نگاروں نے "الطبقات الکبریٰ" کے علاوہ بھی ان کی کئی تالیفات کا تذکرہ کیا ہے۔ جن میں سے کچھ کے بارے میں تفرد بھی پایا جاتا ہے۔ ان تالیفات سے متعلق ڈاکٹر محمد بن احمد الأزوری نے "منهج ابن سعد فی نقد الرواۃ من خلال کتابہ الطبقات الکبری" نامی اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی مقالے میں ضروری تفصیل لکھ دی ہے۔ یہاں صرف ناموں کے

---

[۶] المزی، یوسف بن عبدالرحمن، تهذیب الکمال فی اسماء الرجال، تحقیق: ڈاکٹر بشار عواد معروف، مؤسسة الرسالة، بیروت، ۱۴۰۰ھ/۱۹۸۰ء، جلد ۲۵، صفحہ ۲۵۶، ترجمہ نمبر ۵۲۳۷

[۷] ماخذ سابق۔ ذہبی، شمس الدین محمد بن احمد، تذکرۃ الحفاظ، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء، جلد ۲، صفحہ ۱۱

تذکرہ پر اکتفا کیا جاتا ہے:

۱۔الطبقات الکبریٰ ۲۔الطبقات الصغریٰ ۳۔کتاب الحیل

۴۔کتاب التاریخ ۵۔اخبار النبی

۶۔الزخرف القصری فی ترجمۃ ابی سعید البصری

۷۔ القصد الحلوانیۃ فی افتخار القحطانیین علی العدنانیین و اظھار فضل الیمانیۃ علی النزاریۃ۔

ان کی تاریخ وفات سے متعلق کئی روایتیں پائی جاتی ہیں، جن میں سے ایک روایت یہ ہے کہ ان کی وفات ۲۳۰ ہجری (۸۴۵ء) میں بغداد میں ہوئی اور مقبرہ باب الشام[۸] میں تدفین عمل میں آئی[۹]۔اسی روایت کو اکثر لوگوں نے راجح مانا ہے، کیوں کہ یہ روایت ان کے شاگرد خاص حسین بن فہم کی ہے۔

الطبقات الکبری

نام کتاب: الطبقات الکبری یا الطبقات الکبیر۔

مؤلف: ابوعبدللہ محمد بن سعد بن منیع الھاشمی بالولاء،[۱۰] البصری البغدادی، المتوفی ۲۳۰ھ۔

موضوع: تذکرہ سیرت نبوی کے ساتھ ساتھ صحابہ وتابعین اور انکے بعد کے راویوں کے طبقات کا تعارف۔

محقق : احسان عباس **ناشر:** دار صادر

---

[۸] شہر بغداد کے مغربی دروازے کو باب الشام کہا جاتا تھا۔اور اس سمت میں جو قبرستان تھا اسے مقبرہ باب الشام کہا جاتا تھا۔

[۹] تھذیب الکمال ۲۵/۲۵۷۔الصفدی، صلاح الدین خلیل بن ایبک، الوافی بالوفیات، محقق: احمد الارناؤوط اور ترکی مصطفی، داراحیاء التراث۔بیروت، ۱۴۲۰ھ/ ۲۰۰۰ء، جلد ۳، صفحہ ۷۵

[۱۰] تھذیب الکمال ۲۵/۲۵۶۔ محمد بن سعد، الطبقات الکبری، تحقیق: احسان عباس، دار صادر۔بیروت، ۱۹۶۸ء، جلد ۱، صفحہ ۲

تحقیق شدہ نسخے کی طباعت اولی: ۱۹۶۸ء　　جلدیں: ۸

اجمالی تعارف: تاریخی اعتبار سے اگرچہ طبقات کے فن میں ابن سعد سے قبل الواقدی اور ہیثم بن عدی کی تالیفات آچکی تھیں، لیکن اولیت کا شرف طبقات ابن سعد ہی کو حاصل ہے۔ یہ اپنی اصل صورت میں موجود ہے۔ اسی بنا پر علمائے متقدمین و متأخرین کے نزدیک اس کا درجہ کسی گوہر نایاب سے کم نہیں۔ کیونکہ اس کتاب میں بعض ایسے اشخاص کے تراجم مرقوم ہیں جو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتے۔ اسکی ترتیب میں افضلیت کے ساتھ فرق مراتب کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ اس کا آغاز سیرت نبوی سے ہوتا ہے اور اختتام ان ہستیوں کے تذکرے پر ہوتا ہے جن کی تشبیہ نبی ﷺ نے آب گینے سے دی ہے۔ علامہ شبلی نعمانی نے لکھا ہے: ''یہ کتاب اصلاً ۱۲ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ لیکن قوم کی بد مذاقی سے اس کا کامل نسخہ کسی مقام پر پایا نہیں جاتا۔ ہم نے قسطنطنیہ اور مصر کے کتب خانے دیکھے ہیں۔ وہاں بھی اس کا پورا نسخہ موجود نہیں[۱]۔''

اس کا ایڈٹ شدہ ایڈیشن آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے جس کو جرمن مستشرق پروفیسر ایڈوارڈ ساخاو Eduard Sachau نے ایڈٹ کر کے ۱۹۰۵ء میں لائیڈن سے شائع کیا۔ ابتدائی دو جلدیں سیرت نبوی سے متعلق ہیں۔ اس کتاب کا پہلا باب ''نبی ﷺ افضل النسب ہیں'' ہے۔ اس کے بعد مختلف انبیائے کرام سے نبی ﷺ کے نسبی تعلق کو ثابت کیا گیا ہے۔ اسی طرح سلسلہ وار سیرت طیبہ کے اہم پہلوؤں کو بڑی خوش اسلوبی اور منظم طریقہ سے رقم کیا گیا ہے۔ تیسری اور چوتھی جلد میں صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کے طبقات و حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ پانچویں جلد میں مدنی راویوں کے حالات و واقعات کو قلمبند کیا گیا ہے۔ چھٹی اور ساتویں جلد میں کوفہ، بصرہ اور بغداد کے راویوں کی زندگی بیان ہوئی ہے۔ اس کتاب کی آخری (آٹھویں) جلد عورتوں کے تذکروں پر مشتمل ہے۔ راویوں کی جرح و تعدیل میں اس کتاب کا بھی سہارا لیا جاتا ہے۔ اسکی ایک اہم خوبی یہ بھی ہے کہ ہر ایک بات

---

[۱] ندوی، سید سلیمان، مقالات شبلی، مطبع معارف، اعظم گڑھ، ۱۹۵۶ء جلد چہارم، طبع سوم، صفحہ ا۔ کتاب کے آخری صفحہ کو دیکھنے کے بعد علامہ شبلی کی بات کی تصدیق ہوتی ہے کیوں کہ وہاں پر کلمات شکر وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں ہے، جو کہ مسلم مصنفین کی عادت ہے۔ بلکہ اس جگہ پر یہ عبارت لکھی ہے: آخر طبقات النساء، وهو آخر كتاب الطبقات الكبرى لمحمد بن سعد كاتب الواقدي، رحمهما الله تعالى، والحمد لله وحده وصلاته وسلامه على من لا نبي بعده وعلى آله وصحبه وتابعيه وحزبه جو کہ مرتب یا محقق کی عبارت معلوم ہوتی ہے۔

کو باسند بیان کیا گیا ہے۔ نیز اسے علو اسانید کا درجہ بھی حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ائمہ نے اس کے متعلق حسن رائے کا اظہار کیا ہے۔ علامہ ابن عساکر کا کہنا ہے کہ ''ابن سعد نے الطبقات کے نام سے ایک بڑی ہی عمدہ کتاب تصنیف کی ہے۔ اس کے فائدے بہت ہیں۔ اسمیں ایسی معلومات موجود ہیں جو دوسری جگہوں پر نہیں ہیں اور اس میں صغار و کبار ہر ایک کی روایت کو جگہ دی گئی ہے[۱۲]۔''

طبقات کے راوی: اس کتاب کو ابن سعد سے ان کے مختلف شاگردوں نے روایت کیا ہے۔ لیکن اس کا جو نسخہ آج موجود ہے اس کو ان کے دو شاگردوں یعنی حسین بن فہم اور حارث بن ابی اسامہ نے روایت کیا ہے۔ پھر ان دونوں سے ابن حیویہ الخزاز نے مکمل طبقات کو روایت کیا ہے۔

طبقات میں ابن سعد کا منہج: ''الطبقات الکبری'' اپنے فن کی سب سے قدیم اور اولین ماخذ سمجھی جاتی ہے۔ یہ کتاب ایک ایسے طریقہ ترتیب کی حامل ہے، جس سے اسکی معنویت میں چار چاند لگ جاتا ہے۔ علمی حلقوں میں اسے محوری حیثیت حاصل ہے۔ اس کے منہج و تعارف سے متعلق کئی کتابیں اور تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر عزالدین عمر موسیٰ کی کتاب ابن سعد وطبقاتہ، زید صالح ابولحاج کی کتاب ابن سعد ومنھجہ فی کتابۃ التاریخ، اور محمد بن احمد الأزوری کی منھج ابن سعد فی نقد الرواۃ من خلال الطبقات الکبریٰ وغیرہ۔ چنانچہ انہیں مذکورہ بالا تحریروں کی روشنی میں ابن سعد کے منہج کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کا آغاز مؤلف کے ایک بیان سے کیا جاتا ہے: ''اس کتاب میں ایسے مہاجر و انصار اصحاب رسول کا تذکرہ ہے جن کے نام ہمیں ملے ہیں۔ اور ان کے بعد اولاد و متبعین، علما، فقہا و محدثین میں سے، ان کے اسما، انساب، کنیت اور صفات میں سے جو کچھ بھی ملا ایک ایک کر کے طبقے کے اعتبار سے رقم کیا گیا ہے[۱۳]''۔

۱۔ کتاب کا آغاز سیرت نبوی کے تذکرے سے ہوا ہے۔ جو کہ ابتدائی دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

۲۔ اس کے بعد اصحابِ رسول کا تذکرہ ہے۔ انہیں پانچ طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا طبقہ: اس میں رسول اللہ ﷺ، ان کے اقربا و متعلقین اور بیعتِ عقبیٰ کے بارہ نقبا کا ذکر ہے۔

دوسرا طبقہ: ایسے مہاجر و انصار صحابہ کرام جو قدیم الاسلام تو تھے لیکن بدری نہیں اور حبشہ ہجرت کی تھی۔

---

[۱۲] رواۃ الحدیث ص ۳۶۶

[۱۳] الطبقات الکبریٰ ط۔ دار صادر ۵/۳

تیسرا طبقہ: یہ طبقہ فتح مکہ سے قبل اسلام لانے والے کے لئے خاص ہے۔
چوتھا طبقہ: اس میں ان صحابہ کرام کا تذکرہ ہے جو بوقت فتح مکہ یا اس کے بعد اسلام لائے۔
پانچواں طبقہ: اس میں ان صغارِ صحابہ کا تذکرہ ہے جو نبی ﷺ کے ساتھ کسی جنگ میں شامل نہیں ہوئے۔[۱۴]

۳۔ طبقاتِ صحابہ کو فضائل، تقدیم اسلام اور غزوات میں شرکت کے اعتبار سے تقسیم کیا گیا ہے۔

۴۔ اصحابِ رسول ﷺ کے تذکروں کے بعد تابعین واتباع تابعین وغیرہ کا ذکر بالترتیب ہوا ہے۔

۵۔ کتاب کی آخری جلد میں انساب کے اعتبار سے صحابیہ وغیر صحابیہ عورتوں کے تراجم[۱۵] رقم ہوئے ہیں۔[۱۶]

۶۔ ہر ایک شخص کے ترجمے میں اس کے نام ونسب، کنیت، لقب، مقام ومرتبہ، زہد وتقویٰ، عقیدہ، ظاہری وخلقی اوصاف اور اولاد وازواج وغیرہ کو رقم کیا گیا ہے۔[۱۷]

۷۔ غیر صحابہ کے تراجم پر جرح وتعدیل کے قاعدے کے مطابق نقد بھی کیا ہے۔ ساتھ ہی کثیر یا قلیل الحدیث ہونے کی بھی وضاحت کر دی گئی ہے۔[۱۸]

۸۔ شہروں کے ترتیب میں بھی افضیلت کا خیال رکھا ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس شہر میں سب سے پہلے کس صحابی کا ورود ہوا تھا۔[۱۹]

---

[۱۴] الازوری، محمد بن احمد، منهج ابن سعد فی نقد الرواة من خلال كتابه الطبقات الكبرى، جامعہ ام القری، مکہ مکرمہ، ۱۴۲۲ھ، جلد اول، صفحہ ۳۲

[۱۵] ترجمہ (جمع: تراجم) کا مطلب ہے زندگی کے حالات۔

[۱۶] رواة الحديث ص ۳۶۸-۳۷۱

[۱۷] ماخذ سابق

[۱۸] ماخذ سابق

[۱۹] ماخذ سابق

۹۔ سنین، شہر اور واقعات کے اعتبار سے تراجم کے تکرار کی صورت میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلی جگہ میں تفصیلی تذکرے کے بعد ہر دوسری جگہ اختصار واشارے سے کام لیا ہے۔

۱۰۔ کسی کا ترجمہ کافی زیادہ طویل ہے تو کسی کا اتنا مختصر ہے کہ ایک دو سطر میں ہی مکمل ہو گیا ہے۔

۱۱۔ صحابہ وتابعین کے مقابل میں اپنے معاصرین کے تراجم کو اختصار سے لکھا گیا ہے۔

۱۲۔ ابواب اور وقائع کی ترتیب میں تسلسل کا خیال رکھا گیا ہے۔

۱۳۔ روایات کی ترتیب میں صحت کا کوئی خاص اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔

۱۴۔ متن کے الفاظ سے متعلق خاص احتیاط برتا گیا ہے۔ اور راویوں کے درمیان لفظی اختلاف کو واضح کیا گیا ہے۔

۱۵۔ مواد لینے میں ماہرین فن پر اعتماد کیا گیا ہے۔

۱۶۔ کتاب میں اکثر جگہ لفظ ''قالوا'' استعمال ہوا ہے۔ شارحین کا کہنا ہے کہ اس سے مؤلف کی مراد ان کے استاد الواقدی، ابن اسحاق، ابو معشر اور موسیٰ بن عقبہ ہیں۔

مصادرِ کتاب: طبقات ابن سعد سے متعلق لکھی گئی کتابوں کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مؤلف نے کتاب کی ترتیب میں بنیادی اور ثانوی دونوں مآخذ سے استفادہ کیا ہے لیکن ان کا زیادہ انحصار ابتدائی مآخذ پر رہا ہے۔ مؤلف نے کتاب کی جلد ۳ صفحہ ۵ اور ۶ پر اپنے ابتدائی مآخذ کی واضاحت کرنے کے بعد لکھا ہے: ''ان تمام لوگوں نے مجھے اصحابِ رسول ﷺ اور فقہا و محدث تابعین کے ناموں سے متعلق جو کچھ بھی بتایا ہے انہیں میں نے اکٹھا کر دیا ہے، پھر جہاں تک ممکن ہو سکا موقع و محل کے اعتبار سے ان کے ناموں کی بھی وضاحت کر دی ہے''[۲۰]۔ ثانوی ماخذ کے متعلق طبقات ابن سعد کے محقق احسان عباس لکھتے ہیں: ''ثانوی مآخذ میں سے آپ نے کتاب ازواج النبی، کتاب وفاۃ النبی، کتاب اخبارِ مکّۃ، السیرۃ، طعم النبی اور المغازی کا سہارا لیا ہے۔''[۲۱]

---

[۲۰] الطبقات الکبریٰ ط۔ دار صادر ۳/۵-۶

[۲۱] الطبقات الکبریٰ ط۔ دار صادر ۱/۶

ابن سعد نے اپنے اساتذہ سے روایتیں نقل کرنے میں ماہرین فن کے روایتوں کو فوقیت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایسے شیوخ کی بھی روایتیں نقل کی ہیں جن کو محدثین نے ضعیف کہا یا کسی طرح کی جرح کی ہے، لیکن وہ تاریخ ومغازی وغیرہ کے ماہر تھے۔ اکرم ضیاالعمری لکھتے ہیں "ابن سعد نے الطبقات کی ترتیب کے لئے تقریباً ۶۰ اساتذہ کے روایتیں لی ہیں جن میں سے ایک تعداد ایسے محدثین کی ہے جنہوں نے سیرۃالنبی اور سیرۃالصحابۃ وغیرہ کو قلمبند کیا ہے"۔[۲۲]

طبقات سے متعلق لکھی گئی کتابیں: اب تک اس کے منہج، تتمہ، راویوں اور تعارف وغیرہ سے متعلق بہت سی کتابیں، تحقیقی مقالے اور مضامین لکھے جاچکے ہیں، جو اس بات پر دال ہیں کہ اگرچہ بعض ائمہٗ جرح وتعدیل نے علم حدیث کے میدان میں ابن سعد کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے لیکن ان کی تصنیف کتاب الطبقات اپنے فن میں مرجع خلائق بنی ہوئی ہے۔ ذیل میں اس سے متعلق چند تحریروں کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

۱۔ عواد بن حمید الرویشی: رواۃ الحدیث (النشاۃ، المصطلحات، المصنفات)[۲۳]

۲۔ عزالدین عمر موسی: ابن سعد و طبقاتہ[۲۴]

۳۔ علامہ سیوطی انجاز الوعد المنتقی من طبقات ابن سعد[۲۵]

۴۔ محمد السامرائی: ابن سعد: منہجہ و موارده فی کتابہ الطبقات الکبری[۲۶]

۵۔ محمد باقشیش: محمد بن سعد و کتابہ الطبقات[۲۷]

---

[۲۲] العمری، اکرم ضیاء، بحوث فی تاریخ السنۃ المشرفۃ، بساط۔ بیروت، طبع چہارم، صفحہ ۸۰

[۲۳] دارالمیمنۃ للنشروالتوزیع، دمشق ۲۰۱۸

[۲۴] دارالغرب، بیروت ۱۹۸۶

[۲۵] یہ طبقات ابن سعد کا اختصار ہے، اس کی سافٹ یا ہارڈ کاپی کا مجھے علم نہیں البتہ مصطفی بن عبداللہ کاتب چلپی معروف بہ حاجی خلیفہ کی کتاب کشف الظنون میں اس کا تذکرہ موجود ہے۔ دیکھیں: کشف الظنون، مکتبۃ المثنی۔ بغداد، ۱۹۴۱ء، جلد ۲، صفحہ ۱۱۰۳

[۲۶] عماد الدین للنشروالتوزیع، ۲۰۱۰، تقدیم اکرم ضیاالعمری۔

۶۔ زید صالح ابوالحاج: ابن سعدو منهجه فی کتابة التاریخ[28]

۷۔ محمد بن احمد الازوری: منهج ابن سعد فی نقد الرواة من خلال کتابه الطبقات الکبری[29]

۸۔ صالح بن ہادی الشمرانی الاحادیث و الآثار الواردة فی طبقات ابن سعد : دراسة وتحقیق وتخریج[30]

خلاصہ: مذکورہ بالا بحث کا ماحصل یہ ہے کہ طبقات ابن سعد اپنے فن کی ایسی واحد کتاب ہے جو اپنی اصل صورت میں موجود ہے۔اس کا شمار فن طبقات اور سیرت وتاریخ کے بنیادی مصادر میں ہوتا ہے۔ ترتیب زمانی اور تسلسل و قائع کے اعتبار سے یہ بے مثال کتاب ہے۔ سیرت نبوی سے لے کر اپنے عہد تک کی مشہور واہم علمی شخصیات کا تعارف بڑے اچھے انداز میں کیا گیا ہے۔ تکرار کی صورت میں پہلے اطناب پھر ایجاز کے طریقہ کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ مردوں کے تذکروں کے ساتھ ساتھ کتاب کے آخری حصے میں عورتوں کے کارناموں کو بھی بیان کیا گیا ہے۔اس کتاب کے ذریعے جہاں ایک طرف طبقات نگاری کے فن کو رواج ملتا ہے وہیں دوسری طرف اسے سیرت نگاری کا بہترین نمونہ مانا جاتا ہے۔اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ مؤلف نے سیرت،تاریخ اور تراجم وغیرہ کے باب میں اس فن کے ماہرین پر بھروسہ کیا ہے۔ان تمام خوبیوں کے باوجود اس کے اندر ضعیف و موضوع روایات و وقائع کو اچھی خاصی جگہ ملی ہوئی ہے۔ نیز مختلف مقامات پر اغماض سے کام لیا گیا ہے۔اس کتاب میں مرد و عورت اور شہروں میں سے ہر ایک کے طبقات کو نبی ﷺ سے قربت و بعد کے اعتبار سے تقسیم کیا گیا ہے۔ گویا پوری کتاب میں نبی ﷺ کی شخصیت کو محوری حیثیت حاصل ہے، جو مؤلف کے ایمانی جذبے اور عقیدت نبوی کی دلیل ہے۔

---

[27] پی۔ایچ۔ڈی، مقالہ، جامعہ ابن زہر، المغرب ۱۹۹۶

[28] ایم۔اے۔ مقالہ، جامعہ الاردن، ۱۹۸۶

[29] پی۔ایچ۔ڈی، مقالہ، جامعہ ام القریٰ، مکہ، ۲۰۰۱

[30] پی۔ایچ۔ڈی، مقالہ، جامعة الامام محمد بن سعود ۱۹۹۲

اسلامی معاشیات کی تشکیل و نظریہ سازی میں علماءِ کرام کا حصہ

پروفیسر عبدالعظیم اصلاحی

علی گڑھ

aaislahi@hotmail.com

فکر معاش اور اس کے لیے تگ و دو کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی انسان کی تاریخ، مگر معاشی فکر کی تاریخ کا آغاز قبل مسیح پائے جانے والے یونانی فلاسفہ افلاطون وار سطو سے کیا جاتا ہے۔ جنھوں نے اپنی فلسفیانہ بحثوں میں بعض اقتصادی امور پر بھی کلام کیا ہے لیکن معروف علم معاشیات کی عمر ڈھائی سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔ جہاں تک اسلامی معاشیات کا تعلق ہے تو سو سال قبل اس طرح کی کسی اصطلاح کا کوئی وجود نہیں پایا جاتا تھا[1]، گو کہ اس علم کی بنیاد نزول قرآن کے ساتھ ہی پڑ گئی تھی جب قرآن مجید نے مختلف احکام کے تحت اطعام طعام، کسوہ اور مسکن کے انتظام کا حکم دیا۔ زکوۃ و صدقات کا نظام دیا۔ تقسیم وراثت کا طریقہ بتایا۔ اموال فی وغنائم کی تقسیم کی تفصیلات دیں۔ ربا و خمر کو حرام ٹھہرایا اور تجارت کو حلال قرار دیا نیز فضول خرچی سے اجتناب، بخل سے پرہیز اور ان دونوں کے درمیان اوسط طریقہ اپنانے کی ہدایت کی اور باطل طریقے سے مال کھانے سے منع کیا۔ ان تعلیمات کا عملی نمونہ خود رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام نے پیش کیا۔ بعد میں جیسے جیسے نئے معاملات پیش آتے گئے علماء اسلام نے عقل و اجتہاد سے ان کا حل پیش کیا۔ اس سے اسلام کی اقتصادی تعلیمات میں اضافے ہوتے رہے۔ جلد ہی کتاب الخراج، کتاب الاموال اور احکام السوق کے عنوان سے کتابیں اور

---

[1] سب سے پہلے Islamic Economics (اسلامی معاشیات) کی اصطلاح کا استعمال ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے ۱۹۳۶ء میں اپنے مضمون Islam's solution of the basic economic problems. position of labour میں کیا جو بعد میں اسی موضوع کا ہمیشہ کے لیے پورے عالم میں نام پڑ گیا (اسلامک کلچر *Islamic Culture* حیدر آباد دکن، جلد ۱۰، شمارہ ۲، اپریل ۱۹۳۶ء، صفحہ ۲۱۳۔۲۳۳)

رسائل تصنیف ہونے لگے جن کا اولین ماخذ کتاب اللہ، سنت رسول اور عمل صحابہ رہا۔

یہ سلسلہ چند صدیوں تک جاری رہا تا آنکہ اجتہاد پر قدغن لگنے کی وجہ سے ایجاد و اختراع کی لو مدھم پڑنے لگی اور رفتہ رفتہ نقل و تقلید جامد کا غلبہ ہو گیا۔ علماء کا کام اپنے پیش روؤں کے علمی کاموں کو دہرانے اور ان پر حاشیہ نویسی تک محدود ہو کر رہ گیا۔ اس درمیان اہل یورپ علم و تحقیق اور سیاست و معیشت کے میدان میں اپنے آپ کو مضبوط کرتے رہے۔ یہ سلسلہ بھی کئی صدیوں تک چلتا رہا یہاں تک کہ انیسویں صدی میں بعض مسلم ممالک کے باشندوں کے یورپ سے براہ راست تعلقات قائم ہوئے، کچھ مغربی ملکوں کا سفر کرنے والوں کے ذریعے اور زیادہ تر یورپی ممالک کی مسلم ملکوں میں استعماری سرگرمیوں کی وجہ سے۔ جس کے بعد حالات نے کچھ کروٹ لی۔

اسلامی معاشیات پر توجہ کے اسباب: انیسویں صدی میں مغل حکومت کے خاتمے سے ہندوستانی مسلمانوں میں علم و عمل کے میدان میں سرکاری سرپرستی کے بغیر کچھ کرنے کا احساس پیدا ہوا۔ دینی تعلیم کے لیے دارالعلوم دیوبند اور عصری علوم کے لیے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (M.A.O. College) علی گڑھ کی طرح کے ادارے قائم ہونے شروع ہوئے۔ اسی طرح اقتصادی طور پر بھی اپنے آپ کو مضبوط کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ خاص طور پر سرسید احمد خاں نے اس سلسلہ میں کافی کوشش کی۔ معاشی بہتری کے لیے معاشیات کے علم کی ضرورت کو بھی انہوں نے محسوس کیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایک دارالترجمہ قائم کیا جس میں صنعت و حرفت اور معاشیات کی کتابوں کے ترجمے کو اولیت دی گئی۔[۲]

اردو میں عصری معاشیات پر کتابوں کی دستیابی سے طبقۂ علماء کو بھی کافی فائدہ ہوا جن کی علمی زبان اردو تھی۔ چنانچہ معاشی موضوعات پر لکھتے وقت انہوں نے ان کتابوں سے کافی استفادہ کیا۔ اس چیز کو ان اسباب میں سے ایک اہم سبب شمار کیا جا سکتا ہے جس کی وجہ سے علماء کو سب سے پہلے اسلامی معاشیات پر لکھنے کی طرف توجہ اور ترغیب ہوئی۔

---

[۲] اس طرح کی بعض تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کا مضمون: ''اسلامی معاشیات کی تجدید و تشکیل میں ہندوستانیوں کا حصہ'' در مجموعہ مقالات ''اسلامی معاشیات - مصادر، مباحث، اور تاریخ''، مرتب: عبدالعظیم اصلاحی، نئی دہلی، آئی، او، ایس۔ ۲۰۲۲۔

دوسرا سبب خود بیسویں صدی کے آغاز کے خاص حالات تھے۔ اس صدی کی ابتدا میں ایک طرف نظام سرمایہ داری اپنے عروج پر تھا تو دوسری طرف مارکسی نظریے پر مبنی اشتراکی نظام اپنے قیام کے لیے برسرپیکار نظر آتا ہے اور بالآخر ۱۹۱۷ء میں روس کی سرزمین پر قائم بھی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ علمائے اسلام نے ان دو باہم متحارب نظامہائے معیشت کو پرکھنا اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان کا جائزہ لینا شروع کیا اور یہ ثابت کرنے میں انہیں دیر نہیں لگی کہ اسلام اپنا ایک الگ معاشی نظریہ اور منفرد اقتصادی نظام رکھتا ہے۔

ایک تیسرا اہم سبب یہ تھا کہ ان دنوں آزادی کی تحریک کافی زوروں پر تھی اور یہ سوال ذہن میں اٹھ رہا تھا کہ آزادی کے بعد ہمارا معاشی نظام کیا ہوگا۔ چنانچہ اس کا جواب دینے کا خیال سب سے پہلے ہندوستان کے مسلم علماء اور دانشوروں کے ذہن میں آیا۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی اپنی کتاب کے آخر میں فرماتے ہیں کہ ''اقتصادی نظام کے پیش نظر ہمارے لیے ادائے فرض کی بہترین شکل یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندوں پر اول تحریری و تقریری ذرائع سے یہ ثابت کر دکھائیں کہ علمی و عملی دونوں پہلوؤں سے کائنات انسانی کے لیے امن و اطمینان اور فوز و فلاح صرف اسی صورت میں نصیب ہو سکتی ہے کہ اسلام کے معاشی اصول و قوانین اساسی کو اپنا رہنما بنا لیا جائے''۔[۳]

مولانا مزید فرماتے ہیں:

> اگر ہندوستان جنت نشان میں کمیونزم، سوشلزم، نیشنلزم، فاشزم اپنے اپنے نظامہائے معاش کی تبلیغ و دعوت میں سرگرم نظر آتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اسلام کے نظام معاش کی دعوت و تبلیغ کے لیے میدان تنگ سمجھ کر ہم دست و پا بریدہ بن جائیں اور حرمان و یاس کو رفیق حیات بنالیں۔[۴]

ابتدا میں طبقۂ علماء کی طرف سے اسلامی معاشیات پر تحریریں ہلکی پھلکی نوعیت کی رہیں۔ اسلامی معاشیات پر مستقل کتابوں کا سلسلہ شروع ہونے سے قبل کچھ ہلکے پھلکے مضامین آنا شروع ہوئے۔

---

[۳] سیوہاروی، مولانا محمد حفظ الرحمٰن اسلام کا اقتصادی نظام، دہلی ندوۃ المصنفین، ب۔ت۔، دیباچہ (طبع ششم پر ۱۹۶۹ کی تاریخ درج ہے) ص ۳۹۳۔

[۴] ماخذ سابق ص ۳۹۳۔

۱۹۰۹ء میں مولانا سید سلیمان ندوی نے سود اور اہل کتاب پر ایک مضمون الندوہ میں شائع کیا۔[۵] "تحریم سود" ہی کے موضوع پر مولانا عبدالسلام ندوی نے ۱۹۲۴ء میں معارف (اعظم گڑھ) میں تین قسطوں میں اپنا مضمون شائع کیا۔[۶] خواجہ حسن نظامی نے ۱۹۴۵ء میں "خدائی انکم ٹیکس" کے عنوان سے زکاۃ پر ایک کتابچہ مرتب کیا۔[۷] مولانا حمید الدین فراہی نے آیت ربا میں وارد "وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَى مَيْسَرَةٍ" کے عربی زبان میں "ان" کے استعمال سے یہ ثابت کیا کہ سود پر زیادہ تر قرض لینے والے اہل ثروت ہوا کرتے تھے۔

اس طرح انہوں نے ان لوگوں کو غلط ثابت کیا جو کہتے تھے کہ عرب میں اس وقت کاروباری قرض کا رواج نہیں تھا، قرض لوگ برائے صرف یا استہلاکی مقصد سے لیا کرتے تھے۔[۸] اس موضوع پر مولانا امین احسن اصلاحی نے اپنی تفسیر تدبر قرآن میں اچھی روشنی ڈالی ہے، فرماتے ہیں:

> اس زمانہ میں بعض کم سواد یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عرب میں زمانہ نزول سے پہلے جو سود رائج تھا یہ صرف مہاجنی تھا۔ غریب و نادار لوگ اپنی ناگزیر ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے کے لیے مہاجنوں سے قرض لینے پر مجبور ہوتے تھے اور یہ مہاجن ان مظلوموں سے بھاری بھاری سود وصول کرتے تھے۔ اسی سود کو قرآن نے ربا قرار دیا ہے اور اسی کو یہاں حرام ٹھہرایا ہے۔ رہے یہ تجارتی کاروباری قرضے جن کا اس زمانہ میں رواج ہے تو ان کا اس زمانہ میں دستور تھا نہ ان کی حرمت و کراہت سے قرآن نے کوئی بحث کی ہے۔ ان لوگوں کا نہایت واضح جواب خود اس آیت کے اندر ہی موجود ہے۔ جب قرآن یہ حکم دیتا ہے کہ اگر قرضدار تنگ دست (ذو عسرۃ) ہو تو اس کو کشادگی (میسرہ) حاصل ہونے تک مہلت دو تو اس آیت نے گویا پکار کر یہ خبر دے دی کہ اس زمانہ میں قرض لینے والے امیر اور مالدار لوگ بھی ہوتے تھے بلکہ یہاں اگر اسلوب بیان کا صحیح صحیح حق ادا کیجیے تو یہ بات نکلتی ہے کہ قرض لین دین کی معاملت زیادہ تر مالداروں

---

[۵] ندوی، سید سلیمان، سود اور صحف انبیاء، الندوہ، لکھنؤ، جون ۱۹۰۹ء، ج ۶، شمارہ ۵، صفحات ۲۱-۴۸۔

[۶] ندوی، عبدالسلام، تحریم سود کے علل و اسباب، معارف (اعظم گڑھ) جون ۱۹۲۴ء شمارہ ۶، جلد ۱۳۔ و اگست ۱۹۲۴ء شمارہ ۲، جلد ۱۴۔ تحریم سود مجددین کے دلائل، ستمبر ۱۹۲۴ء شمارہ ۳، جلد ۱۴۔

[۷] نظامی، خواجہ حسن، "خدائی انکم ٹیکس" احکام، مسائل، اور مصارف زکاۃ کا بیان، دہلی ۱۹۲۵ء۔

[۸] فراہی، حمید الدین، مخطوطہ حواشی قرآن کریم، سورہ بقرہ: آیت ۲۸۰۔

ہی میں ہوتی تھی۔ البتہ امکان اس کا بھی تھا کہ کوئی قرضدار تنگ حالی میں مبتلا ہو کہ اس کے لیے مہاجن کی اصل رقم کی واپسی بھی ناممکن ہو رہی ہو تو اس کے متعلق یہ ہدایت ہوئی کہ مہاجن اس کو اس کی مالی حالت سنبھلنے تک مہلت دے اور اگر اصل بھی معاف کر دے تو یہ بہتر ہے۔ اسی معنی کا اشارہ آیت کے الفاظ سے نکلتا ہے۔ اس لیے فرمایا ہے کہ وَإِن كَانَ ذُوعُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَى مَيْسَرَةٍ وَأَن تَصَدَّقُواْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (اگر قرضدار تنگ حال ہے تو اس کی کشادگی ہونے تک مہلت دی جائے) عربی زبان میں "ان "کا استعمال عام اور عادی حالات کے لیے نہیں ہوتا بلکہ عموماً نادر اور شاذ حالات کے بیان کے لیے ہوتا تھا۔ عام حالات کے بیان کے لیے عربی میں اذا ہے۔ اس روشنی میں غور کیجئے تو آیت کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اس زمانہ میں عام طور پر قرضدار ذو میسرہ (خوش حال) ہوتے تھے لیکن گاہ گاہ ایسی صورت بھی پیدا ہو جاتی تھی کہ قرضدار غریب ہو یا قرض لینے کے بعد غریب ہو گیا ہو تو اس کے ساتھ اس رعایت کی ہدایت فرمائی۔[9]

ان متفرق تحریروں کے بعد اسلامی معاشیات پر باقاعدہ تصنیف وتالیف کا دور آیا۔ اس میں علمائے اسلام کا کردار بہت نمایاں اور میر کارواں کا رہا۔ اسلامی معاشیات پر سب سے منظم و مبسوط تصنیف نہ صرف اردو میں بلکہ پورے عالم اسلام میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی کتاب "اسلام کا اقتصادی نظام" ہے جو ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی۔ مولانا دارالعلوم دیوبند کے فارغ تھے اور وہاں استاد بھی رہ چکے تھے لیکن بعد میں جمعیۃ العلماء کی سرگرمیوں میں لگ گئے۔ اسی سلسلے میں کچھ عرصے کلکتہ میں قیام رہا جہاں ان دنوں مولانا ابوالکلام آزاد بھی قیام پذیر تھے۔ دونوں بزرگوں میں سیاسی و علمی قدریں مشترک تھیں۔ کلکتہ میں کمیونسٹوں کا کافی زور تھا۔ ان کے معاشی فلسفہ کا اسلامی جواب دینے کا مولانا سیوہاروی سے مطالبہ ہوا جس کے جواب میں مولانا نے یہ کتاب تحریر کی۔[10]

یہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کا آخری زمانہ تھا۔ سب سے پہلے مولانا نے ۱۹۳۸ء میں ماہنامہ برہان دہلی میں اسلام کے اقتصادی نظام پر ایک مضمون شائع کیا[11]۔ اس کے بعد اپریل ۱۹۳۹ء سے

---

[9] اصلاحی، امین احسن، تدبر قرآن، تاج کمپنی، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء، ج ۱، صفحات ۶۳۹-۶۳۸

[10] عثمانی، شاہ محمد، "مولانا حفظ الرحمٰن" ماہنامہ زاد سفر، اگست ۲۰۰۱، ص ۱۸۔

[11] سیوہاروی، حفظ الرحمٰن اسلام کا اقتصادی نظام، ماہنامہ برہان، جلد اول، ۱۹۳۸ء، شمارہ ۶، ص ۴۰۹۔

ماہنامہ برہان میں اس کتاب کے مضامین مسلسل آنا شروع ہوئے جو پانچ قسطوں میں جولائی ۱۹۳۹ء تک شائع ہوئے۔اسی شمارے میں کتاب کے زیر طباعت ہونے کا ذکر ہے اور جلد شائع ہونے کی توقع ظاہر کی گئی ہے۔[۱۲]

کتاب کا دوسرا ایڈیشن مارچ ۱۹۴۳ء میں منصۂ شہود پر آیا اور بقول مصنف اس ایڈیشن میں نقش اولین کو نقش ثانی بنانے کی پوری سعی کی گئی ہے اور جدید اضافات اور ترمیم واصلاحات نے تقطیع اور ضخامت کی زیادتی نے گو، کتاب کو بالکل نیا جنم دے دیا ہے اور اس طرح وہ پہلے ایڈیشن سے الگ نئی اور مستقل کتاب بن گئی ہے۔[۱۳]

اس کتاب کا تیسرا ایڈیشن ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا۔اس ایڈیشن میں حذف واضافہ دونوں سے کام لیا گیا ہے مگر حذف بہت کم اور اضافہ غیر معمولی ہے۔[۱۴] اس وقت تک ڈاکٹر انور اقبال قریشی کی کتاب ''اسلام اور سود'' آچکی تھی۔اس کی روشنی میں مولانا سیوہاروی نے اس کتاب کے تیسرے ایڈیشن میں سود اور بینکاری کی بحث کا اضافہ کیا جو پہلے ایڈیشنوں میں نہیں تھی۔[۱۵]

اس کے بعد یہ کتاب متعدد بار شائع ہوئی مگر نہ تو مصنف کو اپنی زندگی میں اس پر نظر ثانی کا موقع ملا اور نہ ہی کسی اور نے اس پر حاشیہ آرائی کی ۔ مولانا کی کتاب ''اسلام کا اقتصادی نظام'' اسلامی معاشیات کی پہلی کتاب ہونے کے باوجود بہت سے اہم مباحث پر مشتمل ہے جن کی طرف اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔چونکہ وہ زمانہ کمیونزم کے فروغ کا تھا اسی لیے مصنف نے اس کتاب میں خاص طور پر اسلامی نظام معیشت کا کمیونزم اور سرمایہ داری سے موازنہ کرکے ان دونوں نظاموں کی خرابیاں واضح کی ہیں،[۱۶] اسلامی نظام معیشت کی خصوصیات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے[۱۷] اور اس

---

[۱۲] حوالہ سابق، ملاحظہ ہو ماہنامہ برہان، جلد ۳، شمارہ ۱، جولائی ۱۹۳۹ء، ص ۷۔

[۱۳] سیوہاروی، اسلام کا اقتصادی نظام، حوالہ سابق، ص ۱۴۔

[۱۴] حوالہ سابق، ص ۱۴۔

[۱۵] حوالہ سابق، ص ۱۵، ص ۲۳۷۔

[۱۶] حوالہ سابق، ص ۳۰-۸۰، ۱۸-۷۹، ۳۸۶-۳۸۵، ۳۲۴-۳۸۱۔

[۱۷] حوالہ سابق، ص ۳۵۔

بات پر زور دیا ہے کہ اسلامی اقتصادی نظام کا دین اور اخلاقی قدروں سے گہرا ربط ہے۔[۱۸] مولانا نے اسلامی معاشیات کے مآخذ میں قرآن وسنت کے ساتھ فقہ کو بھی شامل کیا ہے۔[۱۹] بعد کے ماہرین اسلامی معاشیات کی رائے میں فقہ پر اعتماد اکثر مسائل کے حل میں معاون ہونے کے بجائے رکاوٹ ثابت ہوتا ہے کیونکہ فقہ کی نشوونما ایک خاص زمانہ کے مسائل وحالات کے دائرے میں ہوئی تھی۔ بدلتے ہوئے حالات کے نئے پیش آمدہ مسائل میں وہ ہر جگہ ساتھ نہیں دے سکتا۔

مولانا نے اسلامی حکومت کی معاشی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے اس کے ذرائع آمدنی بھی گنائے ہیں۔[۲۰] نیز ملکیت کے مسائل پر گفتگو کی ہے۔[۲۱] مولانا نے ایک بین الاقوامی کرنسی کی تجویز بھی رکھی ہے۔ یہ ایسا موضوع ہے جس پر عصر حاضر کی حکومتیں برابر تجربے کرتی رہی ہیں۔ چنانچہ یورو کی ایجاد اور اسلامی ڈیولپمنٹ بینک کا ''اسلامی دینار'' اسی طرح کی کوششیں ہیں۔ مولانا نے زکوۃ کی معاشی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔[۲۲] یہ خیال رہے کہ دور حاضر میں زکوۃ کے نظام کو اسلامی معیشت کا ایک اہم ترین رکن سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح کی گفتگو بیسویں صدی سے قبل شاید ہی سنی گئی ہے۔ مولانا نے اسلامی نظام وراثت کی خصوصیات سے بھی بحث کی ہے[۲۳] نیز دیگر مذاہب کے معاشی نظریات سے اسلامی نظام معیشت کا موازنہ کرتے ہوئے[۲۴] اسلامی معاشی نظام کا ایک خاکہ بھی پیش کیا ہے[۲۵] اور جمہوریت کی خرابیاں گنائی ہیں۔[۲۶] آخر میں انہوں نے ہندوستان میں اسلامی

---

[۱۸] حوالہ سابق، ص ۳۰، ۸۰، ۳۲۴، ۳۷۹، ۵، ۳۸۱، ۳۸۶

[۱۹] حوالہ سابق ص ۱۰۴-۸۲۔

[۲۰] حوالہ سابق، ص ۳۱۷-۳۰۶۔

[۲۱] حوالہ سابق، ص ۲۷۶۔

[۲۲] حوالہ سابق، ص ۳۴۲-۳۳۲۔

[۲۳] حوالہ سابق، ص ۳۵۲۔

[۲۴] حوالہ سابق، ص ۳۷۰۔

[۲۵] حوالہ سابق، ص ۳۹۰-۳۸۹۔

[۲۶] حوالہ سابق، ص ۳۸۰-۳۱۹۔

معاشی نظام کے قیام کے امکانات کا جائزہ بھی لیا ہے۔[۲۷]

اس کتاب کے تیسرے ایڈیشن کے بعد اس پر کوئی نظر ثانی نہیں ہو سکی۔ اس کی طبع ششم کے وقت، جو ۱۹۶۹ء میں انجام پائی، مفتی عتیق الرحمٰن مرحوم نے لکھا کہ "یقین تھا کہ چھٹا ایڈیشن مولف کی نظر ثانی کے بعد نکلے گا لیکن مولانا مرحوم کی اگست ۱۹۶۴ء میں رحلت ہو گئی اور نظر ثانی کا منصوبہ یوں ہی رہ گیا۔ گذشتہ چند سالوں میں اقتصادیات اور معاشیات کے سلسلے میں بحث و نظر کے جو جدید گوشے ابھرے ہیں، ضرورت ہے کہ ان کو سامنے رکھ کر مولانا کا کوئی فاضل ارادت مند کتاب پر ایک نظر ڈالے"۔[۲۸]

اس بات کو کہے ہوئے بھی اب ساٹھ سال سے زیادہ ہو گئے ہیں، اب تو ضرورت اس بات کی ہے کہ اس عرصے میں علم معاشیات میں جو ترقی ہوئی ہے اس کو سامنے رکھ کر اردو میں معاشیات پر نئے سرے سے کتاب مرتب کی جائے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی کی کتاب اسلامی معاشیات: جدید اسلامی معاشیات کی تاریخ میں دوسری اہم کتاب بھی ہندوستان کے ایک اور عالم مولانا مناظر احسن گیلانی (۱۸۹۴ء-۱۹۵۶ء) کے رشحات قلم کا نتیجہ ہے۔ مولانا کا تعلق بہار کے ایک گاؤں گیلان سے تھا جس کی نسبت سے گیلانی کہلاتے تھے۔ آپ بھی دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ تقریباً ۲۵ سال تک عثمانیہ یونیورسٹی میں دینیات کے استاد رہے۔ وہاں سے ۱۹۴۸ء میں سبک دوش ہوئے۔ اسلامی معاشیات کی طرف ان کی توجہ اس مناسبت سے ہوئی کہ شعبہ دینیات کے ایک طالب علم محمد یوسف الدین نے ایم اے اور پھر پی ایچ ڈی کے لیے اسلامی معاشیات کا موضوع لیا جس کی نگرانی مولانا گیلانی کے ذمے ہوئی۔ اس طرح حیدر آباد کی عثمانیہ یونیورسٹی کا شعبہ دینیات وہ ادارہ ہے جس نے سب سے پہلے اسلامی معاشیات پر پی ایچ ڈی تفویض کی۔ اسی پی ایچ ڈی کی نگرانی کے دوران مولانا گیلانی نے اپنی کتاب "اسلامی معاشیات" مرتب کی۔

اس کتاب کے سلسلۂ مضامین ماہنامہ معارف (اعظم گڑھ) میں اپریل ۱۹۴۳ء سے آنا شروع

---

[۲۷] حوالہ سابق، ص ۳۹۳-۳۵۹۔

[۲۸] حوالہ سابق، طبع ششم، ص ۱۶۔

ہوئے اور اکتوبر ۱۹۴۳ء تک سات قسطوں[۲۹] میں شائع ہوئے۔ پھر ایک طویل وقفے کے بعد معارف اپریل ۱۹۴۴ء سے مولانا کا ایک اور مضمون بعنوان ''اسلامی معاشیات کے چند فقہی و قانونی ابواب'' آنا شروع ہوا، جو اگست ۱۹۴۴ء میں سات قسطوں میں مکمل ہوا۔[۳۰]

اس طرح مولانا گیلانی کی کتاب کا آغاز مولانا سیوہاروی کے بعد ہوا اور ان کی کتاب پہلی دفعہ ۱۹۴۷ء میں ادارۂ اشاعت اردو حیدرآباد دکن سے شائع ہوئی لیکن کتاب کے مقدمے سے، جس پر یکم ستمبر ۱۹۴۵ء کی تاریخ ثبت ہے، یہ واضح ہوتا ہے کہ کتاب تاریخ اشاعت سے دو سال قبل لکھی گئی تھی۔ اسی مقدمہ میں اس بات کا ذکر بھی ہے کہ محمد یوسف الدین نے اپنے ڈاکٹریت کے مقالہ کو دو ضخیم جلدوں میں مرتب کرکے ''اسلام کے معاشی نظریے'' کے عنوان سے مجلس جامعہ کے سامنے پیش بھی کر دیا ہے۔ مولانا گیلانی اپنی کتاب کے مقدمہ میں تحریر کرتے ہیں کہ ''بجز چند مختصر مقالوں یا کسی مختصر رسالے کے سوا جہاں تک میں جانتا ہوں اس موضوع پر اردو ہی میں نہیں بلکہ عربی یا اسی قسم کی دوسری زبانوں میں بھی غالباً اب تک کوئی مستقل کتاب اس موضوع پر نہیں لکھی گئی ہے۔''[۳۱] اوپر ہم نے دیکھا ہے کہ ۱۹۴۵ء سے قبل ہی مولانا سیوہاروی کی کتاب کے دو ایڈیشن آچکے تھے اور ۱۹۴۶ء میں اس کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا۔ تعجب ہے کہ مولانا گیلانی کو اس کا علم نہیں ہوسکا۔

مروجہ نصابی کتابوں کے طرز پر مولانا گیلانی نے کتاب کے آغاز میں اسلامی معاشیات کی تعریف

---

[۲۹] گیلانی، مناظر احسن، ''کتاب اسلامی معاشیات کا ایک باب'' معارف (اعظم گڑھ) جلد ۵۱، عدد ۴، اپریل ۱۹۴۳ء۔ نیز مئی ۱۹۴۳ء تا جون ۱۹۴۳ء، عدد ۶-۵، جلد ۵۲، عدد ۱ تا ۴، جولائی ۱۹۴۳ء تا اکتوبر ۱۹۴۳ء، سات قسطیں۔

[۳۰] گیلانی، مناظر احسن، ''اسلامی معاشیات کے چند فقہی و قانونی ابواب'' اپریل ۱۹۴۴ء، جلد ۵۳، عدد ۴ تا جون ۱۹۴۴ء، عدد ۶-۵، جولائی ۱۹۴۴ء-اگست ۱۹۴۴ء، جلد ۵۴، عدد ۲-۱، کل پانچ قسطیں۔

[۳۱] گیلانی، مناظر احسن، '' اسلامی معاشیات ''شوکت علی اینڈ سنز، کراچی وحیدرآباد، جنوری ۱۹۶۲ء، فاتحۃ الکتاب، صفحہ الف۔

سے بحث کی ہے۔ [۳۲] پھر تفصیل سے اسلام میں معاشی سرگرمیوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ [۳۳] مولانا معاشی جد وجہد کو بھی ایک طرح کا جہاد فی سبیل اللہ قرار دیتے ہیں۔ [۳۴] مولانا کے نزدیک زمین کی آباد کاری اور تعمیر و ترقی مسلمانوں کے قرآنی فرائض میں داخل ہے۔ [۳۵] غیر اقوام کی مفید صنعتوں کو اپنانے میں کوئی پس و پیش نہیں ہونا چاہیے۔ [۳۶] عبادات اور اخلاقی اقدار معاشی سرگرمیوں کو بڑھاوا دیتی ہیں۔ مولانا نے بعض دیگر معاشی نظریات کا اسلامی معاشیات سے موازنہ کیا ہے اور اسلامی معاشی نظام کی برتری ثابت کی ہے۔ [۳۷] اشتراکیت کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ کوئی معاشی نظام نہیں بلکہ قدرت کا انتقام ہے۔ [۳۸] مولانا نے تقسیم دولت سے متعلق اسلامی نظریہ کا جائزہ بھی پیش کیا ہے اور اجتماعی ملکیت سے متعلق اسلامی قوانین بیان کیے ہیں۔ [۳۹] ہندوستان میں ''سود'' کے مسئلے سے بحث کے علاوہ قمار اور سود کے برے معاشی نتائج سے بحث کی ہے۔ [۴۰] مولانا گداگری کے شدید مخالف ہیں۔ ان کے مطابق اس کی سخت مذمت اور ہمت شکنی ہونی چاہیے۔ [۴۱] خراج کے مصارف کے ذکر کے ساتھ وہ بعض شرطوں کے ساتھ حکومت کو زائد محصول حاصل کرنے کا اختیار دیتے ہیں۔ [۴۲]

---

[۳۲] گیلانی، اسلامی معاشیات، ص ۴-۱۔

[۳۳] حوالہ سابق، ص ۷۵-۵۔

[۳۴] حوالہ سابق، ص ۳۴۔

[۳۵] حوالہ سابق، ص ۲۳-۲۱۔

[۳۶] حوالہ سابق، ص ۶۰-۴۴۔

[۳۷] حوالہ سابق، ص ۱۷۷-۱۵۷۔

[۳۸] حوالہ سابق، ص ۳۶۰-۳۱۵۔

[۳۹] حوالہ سابق، ص ۴۰۵-۳۸۴۔

[۴۰] حوالہ سابق، ص ۴۳۴-۴۱۳۔

[۴۱] حوالہ سابق، ص ۴۱۲-۴۱۱۔

[۴۲] حوالہ سابق، ص ۵۱۸-۴۹۰۔

انہوں نے فضول خرچی کے تباہ کن نتائج پر بھی روشنی ڈالی ہے۔[۴۳] نیز صدقات و خیرات سے متعلق اسلامی نقطۂ نظر پیش کرنے کے علاوہ اسلام میں سرمایہ کاری کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔[۴۴] تقریباً چھ سو صفحات کی ضخیم کتاب کے یہ چند موضوعات بطور نمونہ پیش ہیں تاکہ اس سے اسلامی معاشیات میں اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔ ۱۹۸۴ء میں شیخ شوکت علی اینڈ سنز کراچی نے مولانا عبدالقدوس ہاشمی کے ایک مفید مقدمے کے ساتھ اس کو دوبارہ شائع کیا ہے۔

مولانا گیلانی نے اپنی کتاب کو ایک قدیم دینی درسگاہ سے فارغ طالب علم کی ایک رخی کوشش قرار دیتے ہوئے توقع ظاہر کی تھی کہ ''انشاءاللہ اسی کو سامنے رکھ کر کام کرنے والے اس کو بتدریج مکمل کرلیں گے تاآنکہ معاشیات کی دنیا میں اسلامی معاشیات بھی اپنی ایک مستقل جگہ اور صحیح مقام حاصل کرلے۔''[۴۵]

اسلامی معاشیات کے ان دو اولین معماروں (مولانا سیوہاروی و مولانا گیلانی) کے کارناموں سے متعلق یہ کہنا مناسب ہوگا کہ چونکہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی عملی سیاست میں مشغول تھے اس لیے ان کی کتاب میں اسلامی معاشی نظام کا تطبیقی پہلو غالب ہے لیکن مولانا گیلانی کی مصروفیات علمی و تحقیقی تھیں، اس لیے انہوں نے اسلامی معاشیات کے نظریاتی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ یوں دونوں ہی کتابیں بڑی تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی اور اسلامی معاشیات: اسلامی معاشیات کی تجدید و تشکیل میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ انہوں نے ۱۹۳۲ء میں حیدرآباد دکن سے ماہنامہ ترجمان القرآن نکالنا شروع کیا جو اس طرح کے مسائل پر اظہار خیال کے لیے سرگرم فورم ثابت ہوا۔ اس میں سماجی، سیاسی، دینی و معاشی موضوعات پر مولانا خود بھی لکھتے اور دوسرے اصحاب قلم کے مقالات بھی شائع کرتے۔ بعض مسائل پر مباحثے کئی کئی شماروں تک جاری رہتے۔ مثلاً ملکیت زمین سے متعلق مباحثہ

---

[۴۳] حوالہ سابق، ص ۵۵۰-۵۴۸۔

[۴۴] حوالہ سابق، ص ۵۶۵-۵۵۱۔

[۴۵] اسلامی معاشیات، فاتحۃ الکتاب، ص د۔

جس کا آغاز ۱۹۳۴ء کے ابتدائی شماروں میں ہوا، تقریباً سال بھر چلتا رہا۔[۴۶] مولانا مودودی نے بہت پہلے اسلام میں انشورنس، بینکاری، ضبط ولادت، اشتراکیت اور اسلام جیسے موضوعات پر قلم اٹھایا، جس سے بہت سے دوسرے اہل علم کو بھی ان موضوعات پر لکھنے کی تحریک ہوئی۔ ڈاکٹر انور اقبال قریشی، جنھوں نے ۱۹۴۵ء میں اسلام اور سود کے موضوع پر سب سے پہلی کتاب تصنیف کی، اپنی کتاب میں مولانا مودودی کی تحریروں سے کافی فائدہ اٹھایا ہے، جس کا انھوں نے اسی کتاب کے مقدمہ میں کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔[۴۷] مولانا کی کچھ ہی کتابیں تقسیم ہند سے پہلے شائع ہوئیں، ان میں ایک کتاب ضبط ولادت (۱۹۴۳ء) پر ہے ورنہ ان کی زیادہ تر کتابیں تقسیم ہند کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچیں جب قید و بند کی حالت میں دیگر سرگرمیوں سے انہیں فرصت مل گئی اور اپنے نامکمل کاموں کی تکمیل کا موقع مل گیا۔ ''اسلام اور جدید معاشی نظریات'' مولانا کی ایک بیش بہا کتاب ہے۔ مستقل کتابوں کے علاوہ پروفیسر خورشید احمد نے معاشی مسائل سے متعلق مسائل مولانا مودودی کی متفرق تحریروں کو معاشیات اسلام کے عنوان سے یکجا مرتب کر کے شائع کیا ہے۔ اس میں ان کی شروع کی بہت سی تحریریں بھی آگئی ہیں۔[۴۸]

مولانا مسعود عالم ندوی کی کتاب اشتراکیت اور اسلام: علماءِ کرام نے عام طور پر اشتراکیت اور سرمایہ داری کو اپنی تنقیدوں کا نشانہ بنایا ہے۔ اس ضمن میں مولانا مسعود عالم ندوی کی کتاب ''اشتراکیت اور اسلام'' (۱۹۴۹ء) قابل ذکر ہے۔ مولانا کے نزدیک اشتراکی نظام میں دولت کی تقسیم پر زور اور انفرادی ملکیت کے خاتمے کی تحریک دراصل سرمایہ داری کی خرابیوں کے رد عمل کا نتیجہ ہے۔ ان کی رائے میں اس طرح کے انتہائی قدم اٹھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلام نے جو متوسط طریقہ دکھلایا ہے وہ سرمایہ داری کی خرابیوں کے خاتمہ اور سوشلزم کے اچھے نتائج کے حصول کے لیے کافی ہے۔[۴۹]

---

[۴۶] ملاحظہ ہو: مودودی، سید ابوالاعلیٰ، دیباچہ طبع اول (۱۹۵۰ء)، مسئلہ ملکیت زمین، دہلی مرکزی مکتبہ ۱۹۶۹ء، ص ۷۔

[۴۷] قریشی، انور اقبال (بدون تاریخ) اسلام اور سود، حیدرآباد، ادارہ معاشیات، دیباچہ مصنف، ص ۵۔

[۴۸] احمد، خورشید (مرتب) معاشیات اسلام، سید ابوالاعلیٰ مودودی، دہلی مرکزی مکتبہ ۱۹۸۱ء۔

[۴۹] ندوی، مسعود عالم، اشتراکیت اور اسلام، کراچی، مکتبہ چراغ راہ، ۱۹۴۹ء۔

مولانا صدر الدین اصلاحی اور اسلامی نظام معیشت: مولانا صدر الدین اصلاحی کا مختصر رسالہ ''اسلامی نظام معیشت'' ۱۹۵۳ء میں حیدر آباد کے ایک اجتماع میں پیش ہوا تھا۔ یہ رسالہ در قامت کہتر و در قیمت بہتر کی مثال ہے۔ اس میں مولانا نے اسلامی نظام معیشت کے بنیادی فلسفہ اور اجمالی خاکہ پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ اس میں مولانا نے جو باتیں اجمالاً کہی ہیں ان پر بعد کے مصنّفین نے پورے مقالات بلکہ کتابیں تک تحریر کی ہیں۔ ان کے بعض خیالات سے ملتے جلتے نظریات ان کے بہت بعد بعض مغربی ماہرین معاشیات نے پیش کیے جنہیں ان کا بہت بڑا کارنامہ سمجھا گیا۔ مثلاً روٹی، کپڑا اور مکان کا مسئلہ، مادی تصورات پر مبنی فلاحی معیشت کے لیے کارگر ہونے کے نظریے پر تنقید، معیشت کے نشوونما کا اسلامی تصور ارتقاء انسانیت یا فروغ وسائل انسانی کے بغیر ممکن نہیں۔ مولانا کے نزدیک اسلامی نظام معیشت اخلاقی و قانونی دو اہم بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ مولانا کے مطابق اسلامی نظام معیشت کے بنیادی فلسفے کا تقاضا ہے کہ اس میں انفرادی ملکیت کی اجازت ہو مگر اس کے ساتھ اس پر عائد حقوق و واجبات کی ادائیگی بھی لازم ہے۔[۵۰]

مولانا محمد تقی امینی اور اسلام کا زرعی نظام: مولانا تقی امینی نے اسلامی معاشیات سے متعلق متعدد مقالے تحریر کیے ہیں مگر ان کی سب سے اہم کتاب ''اسلام کا زرعی نظام'' ہے جو کتاب کے مقدمے پر لکھی تاریخ کے مطابق سنہ ۱۹۵۴ء میں تیار ہوئی۔ یہ اسلام کے نظام زراعت اور اس سے متعلق مباحث پر ایک مستند اور جامع کتاب ہے۔ اس میں اراضی کی اقسام کے علاوہ مزارعت، اجارہ اور زمین پر عائد ہونے والے محاصیل کی تفصیلات بھی ہیں۔ پہلے یہ کتاب ندوۃ المصنفین سے شائع ہوئی تھی، بعد میں اسے پاکستانی پبلشر احسن اکیڈمی نے ۱۹۸۰ء میں کراچی سے شائع کیا۔[۵۱]

مولانا عبدالباری ندوی کی تجدید معاشیات: مولانا عبدالباری ندوی نے تجدید دین پر کئی کتابیں لکھیں جن میں چوتھی اور آخری کتاب تجدید سیاست پر تھی مگر پھر انہیں احساس ہوا کہ معاشیات کا مسئلہ سیاست سے بڑھ کر ہے، چنانچہ انہوں نے اس سلسلے کو ''تجدید معاشیات'' (۱۹۵۶ء) پر مکمل کیا۔ اس کی ترتیب میں انھوں نے زیادہ تر اپنے پیر و مرشد مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتابوں پر انحصار کیا ہے۔

---

[۵۰] اصلاحی، صدر الدین، اسلامی نظام معیشت، نئی دہلی مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۹۸۳ء، بار دوم، مولانا اصلاحی کے معاشی تصورات کے تفصیلی مطالعہ کے لیے ملاحظہ ہو: اسلامی معاشیات- مصادر، مباحث، اور تاریخ، از عبدالعظیم اصلاحی، نئی دہلی، آئی، او، ایس۔ ۲۰۲۲۔ صفحات ۷۷۔ ۸۴

[۵۱] امینی، محمد تقی، اسلام کا زرعی نظام، کراچی، احسن اکیڈمی ۱۹۸۰ء

مولانا کے نزدیک معاشیات اسلام کی بنیاد کسب معاش یا پیدائش دولت کے بجائے استعمال دولت یا انفاق پر ہے اور یہی تمام معاشی مسائل و مشکلات کا اصولی و قرآنی بے خطا اسلامی حل ہے۔[۵۲]

مولانا مجیب اللہ ندوی اور اسلامی قانون اجرت: اسلامی قانون اجرت (۱۹۸۳ء) پر اب تک بہت کم لکھا گیا ہے۔ مولانا کی یہ کتاب اس موضوع پر شاید کسی زبان میں پہلی کتاب ہے۔ مولانا مجیب اللہ ندوی کے نزدیک جاگیر داری سے سرمایہ داری اور سرمایہ داری سے اشتراکیت کی تبدیلیوں کے باوجود مزدور اور غریب طبقہ ویسے ہی پستا رہا۔ اس مشکل کا حل رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عطا کردہ عادلانہ معاشی نظام میں پنہاں ہے۔ اس میں مولانا نے مزدوروں کے دیے گئے حقوق کے علاوہ محنت کش جانوروں کے حقوق سے بھی بحث کی ہے۔[۵۳]

خاتمہ کلام: اسلامی معاشیات کی تشکیل اور نظر سازی میں ہندوستانی علماء اسلام نے ہراول دستہ کا کام کیا ہے اور مختلف اعتبارات سے ان کی تحریروں کی امتیازی شان رہی ہے۔ اسلامی معاشیات پر علماء کی تحریروں کا سلسلہ اب بھی جاری ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ بیسویں صدی کے نصف ثانی میں انگریزی داں اور عصری جامعات کے فارغین نے اسلامی معاشیات کی زمام علم کو علماء سے لے کر اپنے ہاتھوں میں سنبھال لیا ہے۔

---

[۵۲] ندوی، عبدالباری، تجدید معاشیات، لکھنؤ، ۱۹۵۶ء۔

[۵۳] ندوی، مجیب اللہ، اسلامی قانون اجرت (نظر ثانی کے بعد) نئی دہلی، تاج پرنٹرز ۱۹۹۰۔

سلاطین دہلی کی مذہبی رواداری

ڈاکٹر عاطف عمران

اسسٹنٹ پروفیسر (کنٹریکچول)، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مانو، حیدرآباد

atifimran3231@gmail.com

اسلام امن و سلامتی کا مذہب ہے۔ وہ دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام میں غیر مسلموں کی جان و مال، عزت و آبرو اور حقوق کے تحفظ کو اسلامی ریاست کی ذمہ داری قرار دیا گیا ہے۔ انہیں نہ صرف اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی دی گئی ہے، بلکہ روزگار، تعلیم اور حصولِ انصاف میں برابر کے حقوق بھی دیے گئے ہیں نیز ان کو تکلیف پہنچانے سے مکمل پرہیز کی تاکید بھی کی گئی ہے۔ فتاویٰ عالمگیری میں یہاں تک لکھا ہے کہ ''اگر کسی مسلم نے کسی یہودی یا آتش پرست کو اے کافر، کہہ کر مخاطب کیا، جس سے اس کی دل آزاری ہو جائے، تو ایسا کرنے والا گنہگار ہوگا''۔[1] ایسے مذہب میں جہاں اخوت و محبت کی یہ باتیں سکھائی جائیں، وہاں جبر و استبداد کے الزام کی گنجائش کہاں باقی رہتی ہے؟ اسلام نے ہر عمل کے انتخاب میں لوگوں کو اختیار دیا ہے تاکہ وہ ان لوگوں کے اعمال کا اندازہ کر سکے کہ وہ کون لوگ ہیں جو صحیح اور نیکی کے راستہ کو اختیار کرتے ہیں اور کون غلط اور برائی کے راستہ پر چلتے ہیں۔ رواداری سے متعلق اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والے لوگوں کی ایک جماعت نے جب ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو اپنی مذہبی پالیسی کے بناء پر ایک ایسا نظام حکومت قائم کیا جہاں ہر شخص کو اپنے مذہب و مشرب پر عمل کرنے کی مکمل آزادی تھی تاکہ ہر شخص ملک کی فلاح و بہبود میں اپنی خدمات پیش کر سکے۔

چنانچہ عہد وسطی میں ہندوستان کے طول و عرض پر کم و بیش ساڑھے چھ سو سال تک متعدد مسلم خاندانوں (غلاماں، خلجی، تغلق، سید، لودھی اور تیموری) نے حکومت کی۔ ان مسلم حکمرانوں نے اپنے عہد میں ہندوستان کی تاریخ اور تہذیب و ثقافت کو بہتر سے بہتر بنانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ ہندوستان کی آبیاری اور ہمہ جہت ترقی و خوش حالی ان مسلم بادشاہوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ انہوں نے

---

[1] سید امیر علی (مترجم)، فتاوی عالمگیریہ، مکتبہ رحمانیہ اردو بازار، لاہور، جلد ۵، ص ۹۵۔

پر امن بقائے باہم اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضا کو پروان چڑھایا اور رواداری اور وسعت ظرفی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں مذہبی، لسانی اور نسلی کسی قسم کی تفریق وامتیاز کا کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے اور نہ کسی دنگے فساد کا ذکر ملتا ہے۔ان سلاطین نے یہاں گنگا جمنی تہذیب اور بھائی چارگی کے تصور کو فروغ دیا، نیز انہوں نے امن و سلامتی اور صلح وآشتی کے اصولوں کو بروئے کارلاتے ہوئے اس انداز کی حکومت کی کہ وہ ہندوستانی تاریخ کا ہی نہیں بلکہ عالمی تاریخ کا بھی ایک روشن باب ہے۔ ان سلاطین نے اپنی پالیسی میں مذہبی رواداری کا ایسا نمونہ پیش کیا جس کا اثر آنے والی نسلوں تک دکھائی پڑتا ہے۔ سلاطین دہلی کی مذہبی رواداری پر مشہور مورخ خلیق احمد نظامی اپنی کتاب ''سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات'' میں رقم طراز ہیں:

> ہندوؤں کو نہ صرف پوری مذہبی آزادی حاصل تھی، بلکہ ان کے رسوم وعقائد، فلسفہ وافکار کو نہایت ہی ہمدردانہ طور پر سمجھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ بت پرستی پر طعنہ کے بجائے مسلمان ان کے جذبوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے[۲]۔

سلاطین دہلی کی رواداری اور تعددی سماج سے متعلق ان کے نظریے کو سمجھنے کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ان سلاطین کی فکری نشوونما اور اس دور کے مذہبی حالات کا جائزہ لیا جائے، جن میں ان کے نظریات نے پختگی حاصل کی اور ان حالات کو سمجھا جائے جس نے ان کے طرز حکومت اور فکر و نظر کے انداز متعین کئے۔ سلاطین دہلی کا مذہبی شعور سماج کے مختلف عناصر کے مثبت و منفی رجحانات سے متاثر نظر آتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ایشیا کے مختلف حصوں میں منگولوں نے قتل وغارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ایسے پر خطر حالات سے بچ نکل کر مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت شمالی ہندوستان میں مقیم ہوئی۔ یہ لوگ جن علاقوں سے آئے تھے وہاں ظلم وجور اپنے انتہا پر تھا، جس نے ان لوگوں کو زندگی کے حقائق پر غور وفکر کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جنہوں نے اپنی تمام تر صلاحیتیں دہلی حکومت کو مستحکم کرنے میں وقف کر دیں تاکہ دہلی کو ان خون آشام ہنگاموں سے بچایا جاسکے۔[۳] اس کے علاوہ ایک گروہ نوجوان ترک فاتحین کا تھا جو جوش و خروش کے ساتھ اپنی حکومت کی بنیادیں استوار کرنے کے لئے بے چین تھا۔ دوسری

---

[۲] خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، الجمعیۃ پریس، دہلی، ۱۹۵۸، ص ۴۷۔

[۳] ماخذ سابق، ص ۱۸۔

طرف ہندوؤں کے متعدد طبقات تھے جن میں پہلا طبقہ وہ تھا جن کے ہاتھ سے زمام حکومت چھینی گئی تھی، جو ہر لمحہ سلاطین دہلی کی اینٹ گرانے میں لگے ہوئے تھے۔ دوسرا طبقہ ان کا تھا جو ہندو راجاؤں کے دور میں ذاتی وطبقاتی امتیازات کا شکار تھا، لیکن دور سلطنت میں ان کی حیثیت بدل گئی تھی اور ان کی سماجی پابندیاں ختم کر کے انہیں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کے برابر تسلیم کر لیا گیا تھا۔[۴] ان طبقات کی ذہنی کیفیت ونوعیت مختلف تھی اور سلاطین نہ چاہتے ہوئے بھی ان محرکات کے عمل اور رد عمل سے متاثر ہوتے تھے۔

سلاطین دہلی وامراء پر علماء کا بہت اثر رہا ہے، جس نے ان میں رواداری کی فکر کو بہت جلا بخشی۔ اس دور میں علماء کے دو طبقے تھے: ایک دیندار اور دوسرا علماء سوء۔[۵] پہلا طبقہ اپنے ضمیر وآزادی فکر کو قائم رکھنے کے لئے سیاست سے بے تعلق رہا اور وقت کے لحاظ سے اپنی بے باک رائے رکھی، تو دوسرا گروہ ان علماء کا تھا جو سلاطین وقت سے منسلک ہو کر حبِّ جاہ میں ان کے ہر عمل پر مہر توثیق ثبت کرتا رہتا تھا۔[۶] چنانچہ ان میں منہاج السراج، نجم الدین صغریٰ، حسام درویش وغیرہ وہ علماء تھے جنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد ہی بادشاہ وقت کے حکم کی تعمیل کو بنا لیا تھا اور فرائض سے کوسوں دور ہو گئے تھے۔[۷] وہیں علماء کا وہ گروہ تھا جو سلاطین کی غیر شرعی زندگی پر تنقید کرنے میں ذرہ برابر بھی جھجھک محسوس نہیں کرتا تھا۔ قاضی وجیہ الدین کاشانی، سید نور الدین مبارک، قاضی مغیث، مولانا عبد اللہ وغیرہم ایسے علماء میں شامل تھے۔

اسی طرح سلاطین دہلی کے مذہبی افکار پر مشائخ وصوفیہ کے اثرات بھی پڑے۔ ان بزرگان دین کی سادہ زندگی اور بے لوث خدمت خلق نے عوام کے ساتھ ساتھ سلاطین کو بھی متاثر کیا۔[۸] یہ اثرات براہ راست بھی پہنچے، جیسا کہ التتمش اور بلبن نے اپنے دور کے مشائخ سے عقیدت مندانہ

---

[۴] ماخذ سابق، ص ۱۹۔

[۵] ماخذ سابق، ص ۲۰۔

[۶] ماخذ سابق، ص ۲۱۔

[۷] ماخذ سابق، ص ۲۲۔

[۸] ماخذ سابق، ص ۲۳۔

تعلقات رکھے اور ان کے اثرات بھی قبول کئے جس نے ان کے نظام حکمرانی میں مذہبی رواداری پر عمل پیرا ہونے میں مدد کی۔

ان سلاطین کا ہندوستان میں بود و باش اختیار کرنے کے بعد یہاں کی تہذیب و ثقافت اور سماجی و فکری حالات سے متاثر ہونا بھی ایک فطری امر تھا، کیونکہ نظام حکومت چلانے کے لئے ان کو یہاں کے مقامی باشندگان کا تعاون ضروری تھا۔ چنانچہ ہم اس عہد کی عمارتوں اور سکوں میں ان کے نقوش دیکھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب ۱۳۹۶ء میں قطب مینار کو آسمانی بجلی سے نقصان پہنچا، تو فیروز شاہ نے اس کی مرمت کا کام تین ہندو معماروں ناہا، لوہا اور لشمند کو دیا۔[9] اس کے علاوہ نظام حکومت، مالی انتظام ہو یا پھر مقدمات کا فیصلہ، ہر جگہ ہندوؤں نے مدد کی۔ جس کے نتیجے میں ایک خوشگوار ماحول پیدا ہوا اور ایک نیا سماجی تانا بانا تیار ہوا۔ سلاطین دہلی کے خاندان کے افراد نے ہندو راجاؤں کی شہزادیوں سے ازدواجی تعلقات قائم کیے۔[10] سلاطین دہلی کے مذہبی افکار کی نشوونما میں مسلم معاشرے کے اثرات کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے۔ سلاطین کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کوئی ایسا قدم اٹھائیں جس سے عام مسلمانوں کے مذہبی رجحانات کو ٹھیس پہنچے۔ یہی وجہ ہے کہ علاء الدین خلجی نے جب ایک نئے مذہب کی بنیاد رکھنی چاہی تو اس کو مسلمانوں کی بے چینی و اضطراب نے ایسا کرنے سے باز رکھا۔[11] ان تمام حالات کے نتیجے میں سلاطین دہلی کے اندر رواداری و آپسی اتفاق کا پیدا ہونا بھی لازمی تھا جس نے اس دور کو ایک خوشگوار اور مثالی دور بنا دیا تھا۔

اس دور کے تاریخی مآخذ کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ وہ بلا خوف و خطر بتوں کی پوجا کرتے تھے، دریا میں غسل کرتے تھے اور ناقوس بجاتے تھے۔ یہ کام اکثر علماء و بادشاہوں کے محلات کے قریب کئے جاتے تھے، لیکن کبھی کسی نے مزاحمت نہیں کی۔ خلیق احمد نظامی اپنی کتاب ''سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات''میں جلال الدین خلجی کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ ''ہر روز ہندو پکھاوہ اور کرنا بجاتے ہوئے محل کے نیچے سے گزرتے ہیں اور دریائے جمنا پر

---

[9] ماخذ سابق، ص ۲۶۔

[10] Agha Mahdi Husain, *The Rise & Fall of Muhammad bin Tughlaq*, Luzac, London, 1938, p18.

[11] خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۲۷۔

آکر بت پرستی کرتے ہیں اور احکام شرک کو ہماری نظروں کے سامنے رواج دیتے ہیں''۔ [۱۲] مسلم حکمراں وامراء کے علاوہ مسلمانوں کے مذہبی طبقے نے بھی ہندوؤں کی مذہبی آزادی میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ اس طرح کا ایک واقعہ شیخ نظام الدین اولیاء سے متعلق خلیق احمد نظامی نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے کہ ''ایک دن صبح کے وقت وہ اپنے جماعت خانہ کی چھت پر امیر خسرو کے ساتھ ٹہل رہے تھے۔ نیچے نظر پڑی تو دیکھا کہ دریا کے کنارے کچھ ہندو بتوں کی پوجا میں مصروف ہیں۔ تو فرمایا: ''ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے''(ہر راست قوم کا ایک دین اور قبلہ ہوتا ہے)۔ [۱۳] اس جملے میں مذہبی رواداری کا بحر بیکراں سمٹ آیا ہے۔ یہ بات ایک ایسے دور کی ہے جب مسلمانوں کا سیاسی اقتدار اپنے عروج پر تھا، ایسے میں ایک مذہبی پیشوا کا یہ ارشاد صرف مذہبی رواداری کا ہی نہیں، بلکہ ایک ایسی فکر کا آئینہ دار ہے جس نے ہندوستانی تہذیب کے ہزار رنگ کو سمجھ لیا ہو۔ ذیل کی سطروں میں دہلی سلطنت کے چند مشہور سلاطین کا تذکرہ تاریخی حقائق کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، تاکہ ان سلاطین کی اپنے معاشرے کے باشندوں کے ساتھ رواداری کی تصویر سامنے آسکے۔

قطب الدین ایبک: دہلی پر فتح حاصل کرنے کے بعد پہلا شخص جو سریر آرائے سلطنت ہوا وہ قطب الدین ایبک (۱۱۵۰ء تا ۱۲۱۰ء) تھا۔ سلطنت دور کی داغ بیل اسی کے ہاتھوں عمل میں آئی نیز انتظامی ڈھانچہ کا نقش بھی اسی کے تخلیقی ذہن کا رہین منت تھا۔ قطب الدین ایبک کے بارے میں متعصب غیر مسلم مصنفین اور خاص طور سے انگریزوں نے یہ پروپگنڈا کر رکھا ہے کہ ایبک نے دہلی کی قوت الاسلام مسجد کی تعمیر کے لئے مندر کو منہدم کرادیا، لیکن یہ سراسر بہتان تراشی ہے۔ اس معاملہ پر تاریخی روشنی ڈالتے ہوئے محمد حفیظ اللہ نے اپنی کتاب ''اسلام اور غیر مسلم''میں بارہویں صدی کے دو مستند مؤرخ سعید صفیری اور علامہ صدرالدین صدر کے حوالہ سے اس الزام کو غلط ثابت کیا ہے۔ سعید صفیری نے لکھا ہے کہ مسجد کی تعمیر کے لئے ہندو راجا نے سلطان کی مدد کی اور پتھر بہم

---

[۱۲] ماخذ سابق، ص ۴۷۔

[۱۳] محولا بالا۔

پہنچائے جس کے بدلے ایبک نے انہیں انعام واکرام سے نوازا "[۱۴]۔دوسری طرف سید صدر الدین لکھتے ہیں کہ ایبک خوش تھا کہ اس نے ایک لمبی چوڑی مسجد تعمیر کروادی اور اس کے ہندو بادشاہوں نے اس کی ہر طرح مدد کی۔[۱۵] یہ دونوں تاریخی تذکرے ۱۱۲۹ء سے ۱۲۰۶ء کے درمیانی عرصہ میں لکھے گئے ہیں جو اس وقت کے مستند ترین تاریخی تذکرے میں شامل ہیں۔ان تاریخی حقائق سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان کے مسلم سلاطین کی تاریخ لکھنے میں کس قدر تعصب سے کام لیا گیا ہے اور ایک خوش نما واقعے کو بدنما کر کے پیش کر دیا گیا ہے۔اس کے برخلاف ایسے شواہد کثرت سے ملتے ہیں جن سے ایبک کی مذہبی رواداری، عدل وانصاف، شجاعت وسخاوت وفیاضی کا پتہ چلتا ہے۔اس کی ذاتی خوبیوں کی وجہ سے ہندو بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔تاریخ فخر الدین مبارک شاہ میں مذکور ہے کہ "ایبک نے اپنی سخاوت، کرم وبخشش سے ہزاروں آزاد انسانوں کو اپنا غلام بنالیا"۔[۱۶] اس کے علاوہ اس نے ایک ایسے سماج کی تشکیل کی جہاں اونچ نیچ کا کوئی تصور نہ تھا، لہٰذا ایسے ظالم سماجی نظام کو دفن کر دینے والے کے ساتھ محبت کا ہونا فطری عمل تھا۔

غیاث الدین بلبن: غیاث الدین بلبن(۱۲۱۶ء-۱۲۸۷ء)ہندوستان کا وہ پہلا حکمراں ہے جس نے اس سرزمین پر ایک مستحکم حکومت کی بنیاد رکھی۔[۱۷] بلبن میں فطرتاً آمرانہ صفت موجود تھی، لیکن اس کی اسی صفت کی بناپر اس دور کی نراجی طاقتوں کا سدباب ہو سکا۔ جو التمش کے دور حکومت میں پروان چڑھے تھے۔[۱۸] بلبن نے اپنی حکومت کی بنیاد انسانی تہذیب وثقافت پر رکھی تھی۔[۱۹] اس کا زمانہ ملک کی ترقی وخوشحالی، مذہبی رواداری، ہندو مسلم بھائی چارگی اور قیام امن کے لحاظ سے مثالی دور قرار

---

[۱۴] محمد حفیظ اللہ، اسلام اور غیر مسلم، مسلم اکیڈمی، پھلواری شریف، پٹنہ،، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۵۵، ص ۱۸۹۔

[۱۵] ماخذ سابق۔

[۱۶] خلیق احمد نظامی، سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات، ص ۹۲۔

[۱۷] ایشور ناتھ ٹوپا، ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول، مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ ۱۹۶۲، ص ۴۵۔

[۱۸] ماخذ سابق، ص ۴۶۔

[۱۹] ماخذ سابق

دیا جاتا ہے۔[۲۰] اس کے دور میں رعایا پروری، رواداری اور عدل گستری اور ہندوؤں کے جذبات و احساسات کا اندازہ دہلی کے قریب پالم میں سنسکرت زبان میں ملے اس کتبہ سے لگایا جا سکتا ہے جو ۱۲۸۰ء کا لکھا ہوا ہے جو بعد میں ایک کھدائی کے دوران پایا گیا اور وہ آج دہلی کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ "جب سے اس سلطان ذیشان (بلبن) نے دنیا کا بوجھ اپنے کندھوں پر لیا ہے، لوگ گور سے لیکر غزنی اور درویدا سے رامیشورم تک خوش و فارغ البال ہیں۔ اس کے حکومت میں لوگوں کو آرام و سکون میسر ہے۔ سلطان اپنی رعایا کی اس قدر خیر و خبر رکھتا ہے کہ دنیا کو سہارا رکھنے والے شیش ناگ دھرتی کے بوجھ سے سبکدوش ہو بیٹھے ہیں اور وشنو بھگوان نگہبانی کا خیال چھوڑ کر اطمینان سے دودھ کے سمندر پر محو استراحت ہیں۔"[۲۱] اس عبارت سے یہ بات ظاہر ہے کہ بلبن کے عہد میں غیر مسلم بھی خوش حال اور امن و سکون کی زندگی بسر کر رہے تھے اور وہ ان کے مذہبی جذبات کا خیال کرتا تھا۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ جس طرح ہندو راجاؤں اور عوام کا ذکر مغلوں کے عہد میں ملتا ہے، اس طرح سلاطین دہلی اور خاص کر بلبن کے عہد میں ان کا تذکرہ نہیں ملتا۔ اس کی ایک وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس دور کے بعض مصنفین جیسے ضیاءالدین برنی اور قاضی مغیث الدین نے کبھی نہیں چاہا کہ سلاطین دہلی کی مذہبی رواداری کا پہلو عوام کے سامنے آئے[۲۲] کیونکہ وہ لوگ اس کو برا سمجھتے تھے اور اسکا اثر عوام پر اور خاص کر مسلمانوں پر نہ پڑ جائے، اس لئے انہوں نے اس امر خیر کو عوامی نظر سے دور رکھا۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمارے سامنے جو مواد اور تاریخی کتب موجود ہیں، اس کا بھی صحیح ڈھنگ سے اب تک جائزہ نہیں لیا گیا ہے، جیسے بلبن کے بعد معزالدین کیقباد کے

---

[۲۰] زین العابدین سجاد میرٹھی، انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی، تاریخ ملت، ادارہ اسلامیات انار کلی، لاہور، ۱۹۹۱ء، جلد۳، ص۴۹۶۔

[۲۱] عبداللہ یوسف علی، تاریخ ہند کے ازمنہ وسطی میں معاشرتی واقتصادی حالات، انڈین پریس لیمٹیڈ، الہ آباد، ۱۹۲۸، ص۹۹، ۱۰۰؛ محمد حفیظ اللہ، اسلام اور غیر مسلم، ص۱۹۰۔

[۲۲] سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، دارالمصنفین، اعظم گڈھ، ۲۰۰۹، جلد۱، ص۹۱۔

دربار کے ہندو معززین کا ذکر امیر خسرو نے اپنی کتاب قران السعدین میں کیا ہے۔[۲۳]

یہ بلبن ہی کا کارنامہ اور سیاسی تدبر و جہانبانی تھی کہ جس کی وجہ سے ہندوستان منگولوں کے جبر و تشدد، خون آشام ہنگاموں کی بھٹی بنتے بنتے رہ گیا، جس نے وسط ایشیا کے پورے نظام کو خاک کا ڈھیر بنادیا تھا۔ ایسے میں بلبن کا اپنے ہندو رعایا کے ساتھ برتاؤ مذہبی رواداری اور انسانیت کا بہترین ثبوت ہے۔

علاءالدین خلجی: علاءالدین خلجی (۱۲۶۶ء۔۱۳۱۶ء) کی حکومتی پالیسی پر جبر و تشدد کا الزام لگایا جاتا رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی حکومتی پالیسیاں صرف اس زمانے کے حالات کا نتیجہ تھیں، نہ کہ مذہبی رجحان کا۔ اگر وہ اپنی حکومت کے خلاف بغاوتوں اور سیاسی طاقتوں کا سختی سے مقابلہ نہ کرتا تو اس کی حکومت و بادشاہت ختم ہو جاتی۔[۲۴] علاءالدین خلجی کی اسی پالیسی کی وجہ سے ملک بھر میں امن و امان قائم ہوا۔ اس نے مساوات و برابری کے اصولوں کو نافذ کیا۔ اس نے مذہب اور سیاست کو ہمیشہ الگ الگ خانوں میں رکھا۔ اس کا یہ ماننا تھا کہ مذہب کا تعلق انسان کی معاشرتی اور معاشی زندگی سے ہے جبکہ سیاست کا تعلق حکومت اور بادشاہت سے ہے۔ سیاست کا کام حکومت کو صحیح راستے پر چلانا اور اسے مضبوط بنانا ہے، جبکہ مذہب کا دباؤ حکومتی کاموں میں حرج پیدا کرتا ہے اور اس کی پالیسی اور آزادی میں رخنہ بھی ڈالتا ہے۔[۲۵] دوسری طرف ایک بڑا طبقہ علاءالدین خلجی کو ایک متعصب حکمراں سمجھتا رہا ہے، لیکن تاریخی کتب میں یہ بات وثوق کے ساتھ لکھی ہوئی ملتی ہیں کہ اس نے ہندوؤں کے پیشواؤں کی بڑی عزت و توقیر کی۔ کہا جاتا ہے کہ فرقہ دیگمبر کے پیشوا پورناچندر اور سوئمبر یوگی کے رام چندر سوری کی پذیرائی سلطان کے یہاں بہت زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ دیوگیر کے راجہ رام دیو کے ساتھ علاء الدین خلجی کی رواداری بھی ضرب المثل ہے۔ اس کی مثال عصامی کی کتاب 'فتوح السلاطین' میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ضیاءالدین برنی بھی اپنی کتاب میں رام دیو کے اوصاف کریمانہ کے بارے میں لکھتے ہیں: "می گفتند کہ اصیل و اصیل زادہ را بر سرکاری کردن ہمیں بارآردکہ

---

[۲۳] امیر خسرو، قران السعدین، منشی نول کشور، لکھنؤ، ۱۸۸۵ء، ص ۲۸۔

[۲۴] ایشور ناتھ ٹوپا، ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول، مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، ص ۵۷۔

[۲۵] ماخذ سابق، ص ۵۸۔

ازرامدیو معاینہ می شود"[۲۶] (کہا جاتا ہے کہ اگر ہم کسی شریف اور شریف زادے (امراء واقربا) کو حکومتی ذمہ داری دیں (افسر وغیرہ بنائیں) تو وہ رام دیو کے معاینہ کا نشانہ بنیں گے)۔ مذکورہ عبارت سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ رام دیو کی حیثیت علاء الدین خلجی کی نظر میں مسلم امراء وسلطان کے اقرباء سے بھی زیادہ تھی۔ اس کے علاوہ سید صباح الدین نے عصامی کی کتاب ''فتوح السلاطین'' کے حوالے سے لکھا ہے کہ رام دیو کی ایک لڑکی سلطان علاء الدین کے حرم میں بھی داخل ہوئی تھی، جس سے شہاب الدین خلجی پیدا ہوا۔ اسی طرح ۱۳۱۲ء میں شہزادہ خضر خان کی شادی کے جشن میں راجہ رام دیو اپنے دیگر ہندو راجاؤں کے ساتھ شریک ہوا[۲۷] وہ ان اشعار میں اس کی آمد کا تذکرہ کرتے ہیں:

زگجرات آمد الپ خاں زاد　　بفرماں سہ سر بہ حضرت نہاد
(گجرات سے الپ خاں کا لڑکا آیا اور اس نے تینوں حکموں میں حضرت (بادشاہ) کی اطاعت کی)
شنیدم کہ آورد بس برگ و ساز　　پے کار دخت خود آں سرفراز
(میں نے سنا ہے کہ وہ نیک آدمی اپنی بیٹی کے لئے بہت سارے ساز وسامان تحفے تحائف لایا)
ہماں رام دیو آمد از دیوگیر　　کہ مرشاہ را بود فرماں پذیر
(وہیں دیوگیر سے رام دیو آیا، جو کہ شاہ کا خاص فرماں بردار تھا)

یہ مثالیں سلاطین دہلی کے دور میں رواداری کی شہادت دیتی ہیں۔ لیکن ضیاء الدین برنی اور قاضی مغیث الدین نے انہیں کبھی صحیح طریقے سے پیش کرنے کی کوشش نہیں کی، کیونکہ وہ ہندوؤں کو اسلام کا دشمن سمجھتے تھے۔ ان کے اس عمل کی وجہ سے اس دور کی تاریخ بھی داغدار ہوئی اور مسلم حکمرانوں کی رواداری کا جو بہترین نقش کھینچا جانا چاہیے تھا وہ نہ ہوسکا۔

محمد شاہ تغلق: تغلق خاندان کا بادشاہ محمد شاہ تغلق (۱۴۱۳ء) مختلف النوع صلاحیتوں کا مالک تھا، نیز وہ علم دوست اور عدل وانصاف میں ضرب المثل تھا۔ وہ اپنے عقیدے میں سخت تھا، شریعت محمدیہ میں مداخلت اور مذہب اسلام کے معاملے میں کسی بھی مفاہمت کا روادار نہ تھا، مگر دوسرے مذاہب کے

---

[۲۶] ضیاء الدین برنی، تاریخ فیروز شاہی، ہندوستانی اکیڈمی، الٰہ آباد، ۱۸۶۲ء ص ۳۲۹۔

[۲۷] سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، دارالمصنفین، اعظم گڈھ، ۲۰۰۹، جلد ۱، ص ۹۴۔

بارے میں متعصب بھی نہیں تھا۔ایشور ناتھ ٹوپا اپنی کتاب ''ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول''،میں لکھتے ہیں کہ ''محمد تغلق نے غیر مسلم سماج کے ادنی درجے کے لوگوں کی سرپرستی کی اور ان کی صلاحیت اور قابلیت کی بناپر ان کو اونچے عہدوں پر معمور کیا، جس کی وجہ سے اس زمانہ کی طبقۂ اشراف نے تغلق کے اس رویے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور اس کو بدنام بھی کیا گیا''۔[۲۸] محمد حفیظ اللہ اپنی کتاب ''اسلام اور غیر مسلم''،میں ایشوری پرساد کے حوالے سے لکھتے ہیں: ''محمد شاہ تغلق کے تعلقات ہندوؤں کے ساتھ بہت اچھے تھے''۔[۲۹] اس کی ایک مثال تاریخ میں مذکور ہے کہ سلطان محمد تغلق کے خلاف ایک ہندوامیر نے عدالت میں دعویٰ کیا کہ سلطان نے اس کے بھائی کو بلاسبب مار ڈالا ہے۔ قاضی نے سلطان کو اپنی عدالت میں بلوایا۔ وہ بغیر کسی پندار کے قاضی کی عدالت میں پہنچا، جاکر سلام کیا۔ وہ قاضی کے سامنے ملزم کی حیثیت سے کھڑا ہوا۔ قاضی نے حکم دیا کہ سلطان مدعی کو راضی کرے، ورنہ قصاص کا حکم ہوگا۔ سلطان نے مدعی کو راضی کیا، تو اس کی گلو خلاصی ہوئی۔[۳۰] اس فیصلے سے اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں کہ مسلم فرماں رواؤں نے اپنے عہد حکومت میں غیر مسلموں کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کیا۔

پروفیسر گارڈنر براؤن نے اسی بات کو مزید تفصیل کے ساتھ لکھا ہے:

رہا ہندو رعایا کے ساتھ برتاو، سوان پر سختی وسخت گیری کیسی؟ محمد شاہ تغلق نے تو اکبر سے پہلے ہی ایک طرف ستی کے رسم کو مسدود کرایا، تو دوسری طرف ہندو راجاؤں کو اعلیٰ جنگی مناصب اور دیگر قابل ہندوؤں کو اعلیٰ ملکی خدمات پر فائز کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نے دولت مند ہندوؤں کی دولت وثروت میں مطلق دست اندازی نہیں کی۔ برنی کا زر فرضی پر سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ اس سے ہندوؤں کی دولت مندی وتونگری میں ترقی ہوتی رہی۔ محمد تغلق نے قدیم وجدید ہندو ریاستوں کو نیم خود مختاری کی حالت میں چھوڑے رکھا۔ اس کے طرز

---

[۲۸] ایشور ناتھ ٹوپا، ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول، مسلم ایجوکیشنل پریس، علی گڑھ، ۱۹۶۲ء، ص ۶۴۔

[۲۹] محمد حفیظ اللہ، اسلام اور غیر مسلم، مسلم اکیڈمی، ص ۱۹۱۔

[۳۰] ماخذ سابق، ص ۱۹۲۔

عمل کی دانش مندی سے وہ لوگ تو انکار کر ہی نہیں سکتے جو اکبر کے طرز حکومت کے مداح ہیں۔[۳۱]

محمد فیروز شاہ: چند متعصب مصنفین نے محمد فیروز شاہ کی طرف نامناسب اور غیر حقیقی واقعات کا انتساب کیا ہے۔ غیر مسلموں سے مذہبی آزادی سلب کرنے، مندروں کو منہدم کرنے، مذہبی میلوں میں آمد و رفت پر عام رعایا پر پابندی اور پوجا پاٹ میں رکاوٹیں ڈالنے کے من گڑھت واقعات حکمرانوں کی سیاسی پالیسی اور اس وقت کے حالات کا پس منظر اور پیش منظر پر غور نہ کرنے کا فطری نتیجہ ہیں۔ چوں کہ بعض مندر اور مذہبی میلے اخلاقی بگاڑ، فتنوں اور فحاشی و عریانیت کا اڈہ اور ذریعہ بن گئے تھے، اس لیے اخلاقی تقاضوں کے پیش نظر ان پر پابندی لگانا مملکت کے نظم و نسق کے اعتبار سے مناسب فیصلہ تھا۔ چنانچہ ایشور ناتھ ٹوپا اس بابت لکھتے ہیں کہ ''محمد شاہ نے بحیثیت سرکاری پالیسی مندر نہیں توڑے، بلکہ کہیں شریعت کے تحت اور دوسری طرف عوام کی بھلائی کے پیش نظر ان مندروں کو توڑا جو اس وقت عقیدت و مذہبیت کے گھر کے بجائے شیطانیت کا اڈہ بن گئے تھے''۔[۳۲]

فیروز شاہ تغلق کی حکومت کے بارے میں ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا اپنی کتاب *Politics in Pre-Mughal Times* میں تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فیروز شاہ کی حکومت کی اسپرٹ میں رعایا کی حفاظت مضمر تھی۔ وہ رعایا کی فلاح و بہبود کے لئے ہمیشہ کوشاں رہا۔ اس کے اس جذبہ کا ایک بین ثبوت اس سے ملتا ہے کہ اس نے رعایا کو دو کروڑ ٹنکے کی معافی دی۔ سلطان محمد تغلق کے عہد میں ایک مرتبہ جب بڑی تباہی آئی تو حکومت کی طرف سے رعایا کو دو کروڑ ٹنکے دیے گئے۔ فیروز شاہ کے عہد میں جب اس قرض وصولی کا سوال اٹھا تو معلوم ہوا کہ اگر یہ قرض وصول کیا گیا تو رعایا کی زبوں حالی اور بے چارگی اور بڑھ جائے گی، اس لیے یہ کل قرض معاف کر دیا گیا اور رعایا کے اطمینان کے لئے قرض کے سارے کاغذات ان کے سامنے شاہراہ عام پر جلا کر خاکستر کر دیے گئے۔ یہ عوام کے ساتھ انتہائی ہمدردی کے مظاہرہ کا عجیب و غریب طریقہ تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ فیروز شاہ میں عوام کو مطمئن اور خوشحالی بنانے کا کتنا غیر معمولی جذبہ موجود تھا۔ اس قسم کی شاہانہ نوازشوں

---

[۳۱] پروفیسر گارڈنر براؤن، محمد تغلق کا دور حکومت، ماہنامہ معارف، اعظم گڑھ، جنوری ۱۹۲۰ء، ص۴۶، ۴۷۔

[۳۲] ایشور ناتھ ٹوپا، ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول، ص۸۹۔

سے رعایا کے دلوں میں بھی تشکر اور وفاداری کا صحیح جذبہ پیدا ہوتا تھا، جس سے دونوں کے تعلقات استوار رہتے تھے۔[۳۳]

سلطان فیروز شاہ نے ہندوؤں کی اصلاح کی بہت کوششیں کیں اگرچہ اسلامی تعلیمات کے لحاظ سے اسے ہندوؤں کے عقائد کی اصلاح کا حق نہ تھا۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کی یہ خواہش تھی کہ غیر مسلم زیادہ سے زیادہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ اس امر کے لئے اس نے جبر کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ فتوحات فیروز شاہی میں اس کا جملہ مذکور ہے: ''میں نے اہل ذمہ کو دین کی رغبت دلائی اور اعلان کیا کہ ان میں سے جو کوئی توحید کا کلمہ پڑھے گا اور دین اسلام قبول کریگا، اس کا جزیہ معاف ہو جائے گا اور بہت سے انعامات دیے جائیں گے۔ اس اعلان کے بعد بکثرت ہندو مسلمان ہوئے''۔[۳۴]

فیروز شاہ کے حالات زندگی میں یہ بات بھی ملتی ہے کہ ۱۳۶۱ء میں جب وہ ایک علاقہ نگر کوٹ میں پہنچا، تو وہاں ہندوؤں کے علوم سے متعلق متعدد کتابیں دیکھیں۔ اس نے ان کتابوں کے تراجم کی فرمائش کی اور پنڈتوں کو بلا کر ان سے یہ کام انجام دینے کی خواہش ظاہر کی۔ ان میں ایک کتاب فلسفہ، نجوم اور الٰہیات سے متعلق تھی، جس کو عزالدین خالد خانی نے فیروز شاہ کے حکم پر فارسی میں ترجمہ کیا اور اس کا نام دلائل فیروز شاہی رکھا۔[۳۵] اسی طرح فیروز شاہ کے حکم پر علم نجوم پر سنسکرت کی ایک اہم کتاب ''برہم سمستھا'' کا ترجمہ شمس سراج نے کیا۔[۳۶]

سکندر لودھی: سلطان سکندر لودھی (۱۴۵۸ء۔۱۵۱۷ء) ہندو رعایا کا خصوصی خیال رکھتا تھا۔ ایک دفعہ اس نے دیکھا کہ اہلکاران و عہدیداران میں ہندو نظر نہیں آتے، تو اس نے ہندوؤں کو ان کا یہ حق دینا چاہا۔ مگر معلوم ہوا کہ ہندو فارسی زبان سے بالکل ناواقف ہیں۔ چنانچہ سلطان نے سب سے پہلے

---

[۳۳] ڈاکٹر ایشور ناتھ ٹوپا، *Politics in Pre-Mughal Times*، کتابستان، الٰہ آباد، ۱۹۳۳ء، ص ۲۳۸۔

[۳۴] فتوحات فروز شاہی، مطبع رضوی، دہلی، ص ۲۰۔

[۳۵] عبدالقادر بن ملوک شاہ بدایونی، مترجم محمود احمد فاروقی، منتخب التواریخ، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۲، جلد اول، ص ۱۵۱۔

[۳۶] سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، دارالمصنفین، اعظم گڈھ، ۲۰۰۹ جلد ۱، ص ۱۰۹۔

برہمنوں کو بلا کر ان سے فارسی پڑھنے کو کہا۔انھوں نے اپنی مذہبی ضروریات اور مصروفیتوں کے پیش نظر انکار کر دیا۔پھر چھتریوں سے کہا، مگر یہ فوجی زندگی ہی کو اپنے لیے سربلندی کا ذریعہ خیال کرتے تھے،انھوں نے بھی مجبوری کا اظہار کیا۔ویش قوم کے لوگ تجارت سے زیادہ دلچسپی رکھتے تھے،یہ خدمت مذہباً ان پر فرض تھی،وہ بھی اس ذمہ داری کو قبول نہ کر سکے۔اعلیٰ قوموں میں کایستھوں نے فارسی کو اپنے عروج کا ذریعہ بنایا اور فارسی پڑھنے پر آمادہ ہوئے۔چنانچہ انھوں نے فارسی زبان سیکھ کر مسلمانوں کے عہد سلطنت میں زبردست عروج حاصل کیا اور بڑے بڑے عہدوں پر مامور ہوئے۔انھوں نے مسلمانوں کے علوم میں اتنی دستگاہ حاصل کی کہ ان علوم کا درس دینے لگے۔[۳۷]

اس زمانے تک سرکاری زبان فارسی ہو گئی تھی اور تمام دفتری کام اسی زبان میں انجام پاتے تھے لیکن زبان کی ناواقفیت کی بنا پر غیر مسلم سرکاری عہدوں میں نہیں تھے۔سلطان سکندر کو،ایک مذہبی انسان ہونے کے باوجود،یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ ہندو بھی ہماری رعایا ہے،اس لیے زبان شناسی کے مسئلے کو حل کر کے حکومت کے امور اور عہدے ان کے سپرد کیے جائیں۔اس رواداری کے باوجود اسے بھی ایک کٹر اور سنی مسلمان کے خانے میں شامل کر کے ہندو کش اور متعصب قرار دیا جاتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس نے مندر مسمار کیے،جس کی حقیقت یہ ہے کہ اس کی تخت نشینی سے پہلے ایک واقعہ پیش آیا کہ کروکشتر کے تالاب میں ہندو بکثرت جمع ہوتے اور غسل کرتے تھے،جس سے عریانیت اور بے حیائی پیدا ہوتی۔سکندر نے چاہا کہ اس کنڈ کو تباہ کر کے اس اجتماعی غسل کرنے کو روک دے۔اس لئے اس نے اس زمانے کے ایک عالم مولانا عبداللہ اجودھنی سے استفسار کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ قدیم رسم کو روکنا اور قدیم بت خانہ کو منہدم کرنا بالکل جائز نہیں،اس جواب کے بعد سلطان نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔[۳۸]

اوپر کی تحریر سے یہ اندازہ لگانا آسان ہو گا کہ ہندوستان میں مسلم حکمرانوں کی تاریخ صرف سیاست و فتوحات نہیں رہی ہے،بلکہ اس میں رواداری،فراخ دلی،دل جوئی،اور انسانیت نوازی کے روشن پہلو بھی ہیں،جس کا اعتراف بعض ہندو مورخین نے بھی کیا ہے۔مثال کے طور پر ڈاکٹر تاراچند

---

[۳۷] زین العابدین سجاد میرٹھی، انتظام اللہ شہابی اکبرآبادی، تاریخ ملت، ادارہ اسلامیات انار کلی، لاہور، ۱۹۹۱ء، جلد۳، ص۶۰۹۔

[۳۸] ماخذ سابق، ص۶۰۶۔

اپنی کتاب ''ہندوستانی کلچر پر اسلام کے اثرات''میں رقم طراز ہیں:

جب مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی تو انہوں نے ہندوؤں کو مختلف عہدوں پر مقرر کرنا ضروری قرار دیا۔محمود غزنوی کی فوج میں بھی بکثرت ہندو سپاہی تھے۔۔۔۔۔۔اور جب قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں رہ کر حکومت کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے ملکی نظام کو چلانے کے لئے ہندوؤں کو ہی مقرر کیا۔[۳۹]

پروفیسر سری رام شرما اپنی کتاب ''دی کریسنٹ ان انڈیا''میں لکھتے ہیں:

سیاسی نظام کی اچھائی اور برائی کا انحصار غلبہ واقتدار کی قوت پر نہیں بلکہ ملک کے اچھے نظم ونسق پر ہے لیکن ملک کا نظم ونسق ہر زمانے کے لئے یکساں نہیں ہو سکتا، بلکہ زمانہ وماحول کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔اس لئے مغلوں سے پہلے سلاطین دہلی نے جو نظم قائم کیا اس کو اسی زمانہ کے معیار کے مطابق پرکھنا چاہیے۔یہ سلاطین ہندوستان میں فاتح بن کر ضرور داخل ہوئے لیکن مفتوحین سے ان کا میل جول جیسے جیسے بڑھتا گیا، ان دونوں کے جنگجو یانہ جذبات مٹ کر خوشگوار تعلقات میں تبدیل ہوگئے۔معاشرتی اور ثقافتی امتزاج کے ساتھ سیاسی تعلقات کا بہتر ہونا ضروری تھا،اس لئے مسلمان حکمراں سیاسی نظم ونسق کو جلد سے جلد بہتر بنانے کی کوشش میں لگے رہے۔بلبن کے زمانے سے بابر کے زمانے تک ان فرماں رواؤں کی یہی کوشش رہی کہ حکومت کی سرحدوں کو توسیع کرنے کے ساتھ ملک کے عام نظم ونسق میں ترقی ہوتی رہے۔اس نظام کا اچھا یا برا ہونا، سلاطین اور ان کے صوبے کے گورنروں کے ذاتی اوصاف اور کردار پر بھی منحصر تھا۔[۴۰]

ان اقتباسات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ان ہندو مورخین نے سلاطین دہلی کے حکمرانوں کی پالیسیوں کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ پایا ہے کہ ان کے نظام حکومت میں ایسی کوئی پالیسی نہ تھی جس سے آپسی تعلقات میں ناخوشگواری پیدا ہوا اور نہ ہی تعددیت اور بھائی چارگی کی زندگی گزارنے میں کسی طرح کی رکاوٹ ہو۔اس کے ساتھ ہی ان اقتباسات میں مذہبی رواداری کی جن بنیادوں اور اصولوں کو پیش کیا گیا ہے اس سے اس دور میں ہندو مسلم اتحاد ووفاداری کا خاکہ دیکھا جا سکتا ہے۔

---

[۳۹] ڈاکٹر تاراچند، *Influence of Islam on Indian Culture*، دی انڈین پریس، الہ آباد، ۱۹۴۶، ص ۱۳۶۔۱۳۷۔

[۴۰] ایس آر شرما، *The Crescent in India*، کرناٹک پبلشنگ ہاؤس، ممبئی، ۱۹۳۷ء، ص ۱۸۹۔۱۹۰۔

''نسیمِ حجاز'' حمدیہ اور نعتیہ شاعری کا گلدستہ

ڈاکٹر امتیاز احمد

لکچرار ہائر ایجوکیشن، گورنمنٹ ڈگری کالج بیروہ، بڈگام، جموں وکشمیر

imtiyazshaheen91@gmail.com

اردو ادب کی شعری روایت میں ابتدا ہی سے حمد اور نعت گوئی کا رجحان رہا ہے۔ ہر شاعر نے اس میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔ اردو ایک مشترکہ تہذیب کا نام ہے۔ اس میں تمام قوموں کے لوگوں نے اپنا حصّہ دے کر اس کی آبیاری کی ہے۔ اردو ادب کا طالب علم جب نعت گوئی کی تاریخ پر نظر ڈالتا ہے تو حیرت کی انتہا نہیں رہتی کہ ابتدا ہی سے مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم شعرا نے بھی حمدیہ کلام لکھا ہے اور حضورﷺ کی شان میں نعت لکھے ہیں۔ ان شعرا میں آنند نرائن ملا، تلوک چند محرومؔ، نریش کمار شادؔ، رانا بھگوان داس، کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ، اور جگن ناتھ آزادؔ کے نام پیش کئے جا سکتے ہیں۔

جگن ناتھ آزاد کا شعری مجموعہ ''نسیمِ حجاز'' ۱۹۹۹ء میں منظرِ عام پر آیا۔ یہ مجموعہ نعت، منقبت، اور اسلامی تعلیمات سے عبارت ہے۔ اس کے نام سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حمد و نعت کا مجموعہ ہے۔ آزادؔ نے اسلامی تعلیمات کا کافی مطالعہ کیا ہے۔ وہ شعائر اسلامی اور پیغمبر اسلام کے بہت بڑے مداح ہیں۔ اس مجموعے میں آزادؔ نے مسلمانانِ عالم کی گذشتہ عظمت کو یاد دلایا ہے اور انہیں دعوت فکر دیتے ہیں کہ وہ اسلامی اصولوں کو اپنا کر اپنے کردار کی از سر نو تشکیل کریں۔

جگن ناتھ آزادؔ کو اسلامی تعلیمات اور شعائر اسلامی سے بے پناہ قربت تھی۔ انہوں نے جو حمد، نعت، منقبت اور سلام لکھے ہیں ان کے تراجم مختلف زبانوں میں بھی ہو چکے ہیں۔ آزادؔ کی مثنوی ''جمہور نامہ'' کے حصّہ ''ولادت باسعادت'' کو کئی زبانوں میں شائع کیا جا چکا ہے۔ فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ اسلامی علوم کے ماہر ڈاکٹر حمید اللہ نے *Homage A Mohammed* کے نام سے کیا ہے۔ ''نسیمِ حجاز'' میں انہوں نے اپنے حمدیہ اور نعتیہ کلام کو یکجا کر کے مرتب کیا ہے۔

''نسیمِ حجاز'' اپنے آپ میں آزادؔ کی وسیع المشربی اور اسلامی علوم سے آگہی کی ایک بڑی دلیل ہے۔ اس مجموعے میں انہوں نے حمدیہ اور نعتیہ کلام کو مختلف اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ اور کئی ہئیتوں میں پیش کیا ہے۔ ''نسیمِ حجاز'' میں شاعر نے جن عنوانات کے تحت حمدیہ

اور نعتیہ کلام کو سمیٹا ہے، ان میں حمد و نعت سے منقبت تک، دعا، ولادت باسعادت، میلاد النبی ﷺ سلام، محفل نعت میں ایک رات، قطعۂ فیضانِ ارضی، تضامین، حضرت کلیم اللہ ولی کی درگاہ، دہلی کی جامع مسجد، تاریخ ہند کا ایک واقعہ، ہندوستان ہمارا، بھارت کے مسلمان، قرطبہ سے ویلینشیا (بلنسیہ) تک، ایک مشرقی رقاصہ کے نام، مرثیہ، ابوالکلام آزاد، کشور ہندوستان، بابری مسجد اور اقبال شامل ہیں۔ ان شعری تخلیقات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آزاد کی اسلامی تعلیمات اور تاریخ سیرت النبی ﷺ پر اچھی خاصی نظر تھی۔ آزادؔ "نسیم حجاز" میں ایک بہترین عقیدت مند نظر آتے ہیں۔ نسیم حجاز کے ذریعے آزادؔ نے اسلام کی تبلیغ اور نشر و اشاعت کا کام بھی کیا ہے۔ "ولادت با سعادت" میں آزادؔ کی نعت گوئی عروج پر نظر آتی ہے۔ آزادؔ کے انداز بیان میں خلوص نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار:

مجھے لکھنا ہے اک انسانیت کا بابِ تابندہ
منور جس کے ہوں الفاظ، مصرع جس کے رخشندہ

مجھے اک محسنِ انسانیت کا ذکر کرنا ہے
مجھے رنگِ عقیدت فکر کے سانچے میں بھرنا ہے

بیاں کرنا ہے اوج ابن آدم بن کے کون آیا
بیاں کرنا ہے فخرِ ہر دو عالم بن کے کون آیا

بشارت جس کی دی تھی ابنِ مریم نے زمانے کو
وہ ہستی کون تھی کیوں آئی تھی محفل سجانے کو[1]

"نسیم حجاز" میں آزادؔ نے سلام بھی لکھے ہیں جو نعت گوئی کے عمدہ نمونے ہیں۔ سلام کے اشعار شاعر کی عقیدت اور احترام کی گواہی دیتے ہیں اور ساتھ میں ان کی فنی پختگی کا بھی پتہ چلتا ہے:

سلام اس ذاتِ اقدس پر، سلام اس فخر دوراں پر
ہزاروں جس کے احسانات ہیں دنیا کے امکاں پر

سلام اس پر جو حامی بن کے آیا غم نصیبوں کا!
رہا جو بیکسوں کا آسرا مشفق غریبوں کا

سلام اس پر جو آیا رحمۃ للعالمیں بن کر
پیام دوست لے کر صادق الوعد وامیں بن کر[2]

"میلاد النبی" کے موضوع پر "نسیم حجاز" میں ایک نعت رسول اکرم ﷺ کی ولادت کے واقعے کو بیان کرتی ہے۔ اس نظم میں جذبات کی سچائی، خلوص اور سادگی جابجا نمایاں ہے۔ اشعار ملاحظہ ہوں:

---

[1] آزاد، جگن ناتھ، نسیم حجاز، نئی دہلی، محروم میموریل لٹریری سوسائٹی، ۱۹۹۹، صفحہ ۶۵۔۶۶

[2] ماخذ سابق صفحہ ۴۷

آج کا دن تھا جب نور معانی کے طفیل　　تیرہ و تار زمیں مطلعِ انوار ہوئی
آج کا دن تھا کہ ظلمات سے ہو کر بیزار　　زندگی جلوۂ پنہاں کی طلب گار ہوئی
آج کا دن تھا جب باد بہاری کے سبب　　خس و خاشاک کی دنیا گل و گلزار ہوئی[۳]

''نسیم حجاز'' میں حمد و نعت اور منقبت کے علاوہ جو تخلیقات ملتی ہیں، ان کا تعلق بھی کسی نہ کسی طور پر اسلامی تاریخ یا تعلیمات ہی سے ہے۔ ان نظموں میں حضرت کلیم اللہ ولی کی درگاہ پر، تاریخ ہند کا ایک واقعہ، دہلی کی جامع مسجد اور ہندوستان ہمارا شامل ہیں۔ دہلی کی جامع مسجد کو سرزمینِ ہند میں اسلامی تہذیب کی ایک عمدہ یادگار تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ شاہ جہاں کے زہد و تقویٰ کو بھی موضوع بنایا ہے۔ ''ہندوستان ہمارا'' نظم میں حضرت نظام الدین اولیاء کی شخصیت اور تعلیمات کو موضوع بنایا ہے۔ ان کو وہ قطب دوراں کے خطاب سے یاد کرتے ہیں۔ نظام الدین اولیاء کی شان میں جو اشعار لکھے گئے ہیں، پیش خدمت ہیں:

نظام الدین محبوبِ الٰہی جن کو کہتے ہیں　　یہاں کی اور وہاں کی بادشاہی جن کو کہتے ہیں
جنید و بایزید وقت انھیں تاریخ کہتی ہے　　وہ جن کی یاد سے یادِ مسیحا زندہ رہتی ہے[۴]

''نسیم حجاز'' میں آزادؔ نے کچھ نظمیں ایسی لکھی ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح اسلام ہی سے ہے۔ ان نظموں میں بھارت کے مسلمان، ابوالکلام آزادؔ، کشور ہندوستان، بابری مسجد اور اقبال شامل ہیں۔ ''بھارت کے مسلمان'' آزادؔ نے تقسیم وطن کے بعد ہی لکھی ہے۔ اس نظم کے ذریعے آزادؔ نے ہندی مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی اور ان کو حوصلہ دیا ہے۔ مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ یہ وطن جتنا ہندوؤں کا ہے اتنا ہی مسلمانوں کا بھی ہے۔ اس کے علاوہ اس نظم کے ذریعے مسلمانوں کو ان کا شاندار ماضی یاد دلا کر انہیں از سر نو ترقی کی راہ پر گامزن ہونے کی ترغیب دی ہے۔ اس نظم کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ نظم مختلف رسالوں کی زینت بنی، اس نظم کے جواب میں ملک کے شاعروں نے جذبۂ شکر کے عنوان سے نظمیں لکھ کر آزادؔ کا شکریہ ادا کیا۔ یہاں تک کہ دارلعلوم دیوبند میں اس نظم کا بڑا فریم بنا کر اس کو وہاں کی گیلری کی زینت بنایا گیا ہے۔ ایک قدر دان نے ''بھارت کے مسلمان'' کو کتابی صورت میں چھاپ کر مفت تقسیم بھی کیا ہے۔

''بابری مسجد'' کی شہادت کا المیہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ اس نے فرقہ پرستی کو

---

[۳] ماخذ سابق ص ۶۷

[۴] ماخذ سابق ص ۱۰۶

تقویت دی۔اس حادثے سے جگن ناتھ آزادؔ بہت غمگیں ہوئے۔اس کا اظہار انہوں نے ایک نظم کی صورت میں کیا ہے:

یہ تو نے ہند کی حرمت کے آئینے کو توڑا ہے　　خبر بھی ہے تجھے مسجد کا گنبد توڑنے والے
ہمارے دل کو توڑا ہے عمارت کو نہیں توڑا　　جہالت کی بھی حد ہوتی ہے اے حد توڑنے والے
تیرے اس فعل سے اسلام کا تو کچھ نہیں بگڑا　　مگر گھونپا ہے خنجر تو نے ہندو دھرم کے دل میں
مروّت جس کو کہتے ہیں مودت جس کو کہتے ہیں　　یہ مسجد اس مروّت اس مودت کی علامت ہے
اسی کے ساتھ تو ایک اپنا مندر بھی بنا لیتا
وہی تیرا بڑا پن تھا وہی تیری کرامت تھی[۵]

آزادؔ نے اس نظم کے ذریعے شدّت پسند جنونیوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ تم انسانیت کے دشمن ہو، تمھاری وجہ سے مذاہب کی بدنامی ہوتی ہے، تم انسانیت کے نام پر کلنک ہو۔ نظم کے آخر میں شاعر نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ مسجد لوگوں کے دلوں میں آج بھی زندہ ہے اور ابھی دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو دلوں کو جوڑنا جانتے ہیں:

یہ مسجد آج بھی زندہ ہے اہلِ دل کے سینوں میں　　خبر بھی ہے تجھے مسجد کا پیکر توڑنے والے
ابھی یہ سر زمیں خالی نہیں ہے نیک بندوں سے　　ابھی موجود ہیں ٹوٹے ہوئے دل جوڑنے والے[۶]

جگن ناتھ آزادؔ کی اسلام دوستی اور حُبِ اسلام ان کی ذاتی زندگی، ان کی شاعری اور نثر میں بھی ملتی ہے۔اس کے حوالے سے مولانا ضیاءالدین اصلاحی ''نسیم حجاز'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> جگن ناتھ آزادؔ کے مضامین نظم و نثر میں رنگِ حرم بہت نمایاں ہے جس کی ایک ہلکی سی جھلک دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مقصود احاطہ ہیں بلکہ یہ دکھانا ہے کہ اقبالیات کے اس شارح و ترجمان نے اسلامی حقائق و معارف کی ترجمانی کا حق مکمل طور سے ادا کر دیا ہے۔اس نے جن موضوعات سے تعریض کیا ہے ان پر کوئی مسلمان فاضل بھی اس سے بہتر کیا لکھے گا، کم از کم یہ کم سواد تو اس کی جرأت و ہمت بھی نہیں کر سکتا۔[۷]

---

[۵] ماخذ سابق ص ۱۵۱۔۱۵۲

[۶] ماخذ سابق ص ۱۵۴

[۷] ماخذ سابق ص ۵۴

اخبارالاخیار کا ایک اور خاتمۃ الکتاب

ڈاکٹر عارف نوشاہی

ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد

naushahiarif@gmail.com

اس سے پہلے راقم الحروف کا ایک مضمون اسی موضوع پر ماہ نامہ **معارف**، اعظم گڑھ، جلد ۲۰۷، عدد ۲، فروری ۲۰۲۱ء، ص ۱۱۴۔۱۲۴ میں شائع ہو چکا ہے۔ اب راقم السطور کو اخبارالاخیار کا ایک اور خاتمۃ الکتاب ملا ہے۔ مناسب جانا کہ اسے بھی قارئین کے علم میں لایا جائے۔

(۱)

اخبارالاخیار کا قلمی نسخہ مخزونہ کتاب خانہ مجلس شوراے اسلامی (سابقہ نام: مجلس شورای ملی)، تہران، شمارہ ۱۰۵۸۸ نظر سے گذرا۔ جس کے آخر میں ایک بالکل مختلف ''خاتمۃ الکتاب'' درج ہے۔ اس خاتمۃ الکتاب پر بات کرنے سے پہلے نسخۂ تہران کی کیفیت بتا دی جائے۔

یہ نسخہ ۳۷۴ ورق پر مشتمل ہے۔ ابتدا سے دو ورق ناقص ہے۔ اس کی تکمیل معاصر ایرانی خط میں کسی دوسرے نسخے کو سامنے رکھ کر دی گئی ہے۔ ابتدائی نواقص کے بعد اصل نسخہ اس عبارت سے شروع ہوتا ہے: 'و شوق و محبت و ذوق و معرفت و قرب و ولایت و نبوت و رسالت و عزم۔'[۱] نسخہ آخر سے مکمل اور شیخ محدّث کے نعتیہ قصیدۂ نونیہ پر ختم ہوتا ہے، لیکن کاتب نے ترقیمہ نہیں لکھا اور محض '' تمت الکتاب بعون الملک الوهاب'' لکھ کر کتاب ختم کر دی ہے۔ اسی خط میں اگلے صفحے پر خاتمۃ الکتاب درج ہوا ہے۔ اس کے آخر میں بھی کسی قسم کا ترقیمہ اور تاریخ کتابت نہیں ہے۔ قرائن سے خط گیارہویں صدی ہجری کا متعین کیا جا سکتا ہے۔ کتب خانے کے فہرست نگار کا بھی یہی گمان ہے۔[۲] نسخہ خوش، واضح اور صاف خط نستعلیق میں لکھا گیا ہے۔ اصحاب تراجم کے اسما اور عبارت '' نقل

---

[۱] مطابق اخبارالاخیار طبع تہران، ص ۴ سطر ۹

[۲] محمود طیار مراغی، فہرست نسخہ ہای خطی کتابخانہ مجلس شورای اسلامی، ناشر: کتابخانہ، موزہ و مرکز اسناد مجلس

است‘‘ اور کچھ دیگر چھوٹے چھوٹے عنوانات سرخی میں ہیں اور بعض الفاظ کے اوپر سرخ لکیر کھینچی گئی ہے۔ معلوم نہیں یہ اہتمام اسی تصریح کے مطابق ہے جو زیر بحث ’’خاتمۃ الکتاب‘‘ میں بسلسلہ کتابت ہوئی ہے؟ یا کاتبِ نسخہ کا اپنا کوئی اہتمام ہے۔ یہاں شاید یہ گمان کرنا مناسب نہ ہو کہ نسخۂ تہران کی سرخیاں اور خط کشیدہ الفاظ چونکہ مصنف کے اسلوب کے مطابق ہیں، لہذا یہ نسخۂ مصنف ہو سکتا ہے۔ اگر یہ نسخہ شیخ محدّث کے اپنے قلم سے ہوتا تو اپنے معہود کے مطابق وہ دستخط مع تاریخ کتابت و مقام کتابت ضرور لکھتے۔ انسب رائے یہی ہے کہ نسخۂ تہران کے کاتب کے سامنے ایسا نسخہ تھا جس میں یہ خاتمہ موجود تھا اور وہ محض ناقل ہے اور اس نے مصنف کے اسلوب کتابت کی پیروی کی ہے۔ نسخے کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ تصحیحات اور متن میں قلم انداز الفاظ یا عبارات کو حاشیے میں لکھا گیا ہے۔

ورق ۳۶۷ سے نسخے میں معمولی کرم خوردگی کے آثار ہیں جو بعد کے اوراق میں قدرے بڑھ گئے ہیں۔ آخری صفحہ، جس پر یہ خاتمۃ الکتاب درج ہوا ہے، دائیں حاشیے سے قدرا پھٹا ہوا ہے اور تحریر کی پہلی سطر کا پہلا لفظ ضائع ہو چکا ہے۔ اس سطر کا موجودہ پہلا لفظ قرینے سے ’’تسوید‘‘ پڑھا جاتا ہے۔ اس صفحہ کی سطور ۱ تا ۹ کرم خوردگی سے متاثر ہیں لیکن یہ کرم خوردگی ایسی نہیں کہ عبارت پڑھی نہ جا سکے۔ صرف سطر ۷ میں لفظ ’’ملفوظات و‘‘ اور ’’رسائل‘‘ کے درمیان دو الفاظ ایسے ہیں جو کرم خوردہ ہونے کی وجہ سے ٹھیک طرح سے پڑھے نہیں گئے۔ ان الفاظ کے جو حروف باقی بچے ہیں وہ ’ک‘ اور ’ور س‘ جیسے ہیں۔ چونکہ ک کے بعد ب کا ایک نقطہ بھی نظر آرہا ہے اس لیے میں نے اسے قیاساً لفظ ’کتب‘ پڑھا ہے۔ رسائل صاف پڑھا جاتا ہے لیکن اسے پہلے ور س نما لفظ کیا ہے؟

نسخے پر چونکہ کتابخانۂ شورای ملی سال تاسیس ۱۳۰۲ شمسی [۱۹۲۳ء] اور شیر و خورشید اور تاج والی مہر ثبت ہے، لہذا یہ بات اطمینان سے کہی جا سکتی ہے کہ کتب خانے میں اس نسخے کا داخلہ پہلوی دور حکومت میں ہوا تھا۔ کتب خانے نے یہ نسخہ سیدیان مہاباد[۳] سے مبلغ چھ سو تومان میں خریدا تھا جیسا

شورای اسلامی، تہران، ۱۳۸۸ش، جلد ۱/ ۳۳، ص ۱۱۹؛ نیز: مصطفی درایتی، فہرستگان نسخہ ہای خطی ایران، سازمان اسناد و کتابخانہ ملی جمہوری اسلامی ایران، تہران، ۱۳۹۰ش، ص ۳۳۷-۳۳۸

[۳] ایرانی صوبے آذربایجان غربی کے شہر مہاباد میں کتابفروشی سیدیان کا سراغ اب بھی ملتا ہے۔

کہ ظہر نسخہ کی ایک یادداشت سے معلوم ہوتا ہے۔

(۲)

چونکہ اس خاتمۃ الکتاب سے اخبار الاخیار کی تصنیف کی تاریخ، مراحل و مناہج، اسلوب اور طریقۂ کتابت سے متعلق مفید معلومات ملتی ہیں راقم نے چاہا کہ اسے بھی منظر عام پر لایا جائے۔ یہ خاتمۃ الکتاب راقم نے نسخۂ تہران کے علاوہ تاحال کسی اور مخطوطہ یا مطبوعہ میں نہیں دیکھا۔[۴] **شیخ محدّث** کے سوانح نگاروں بالخصوص پروفیسر خلیق احمد نظامی نے حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی میں اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔

اس خاتمۃ الکتاب سے **اخبار الاخیار** کے بارے میں جو اہم باتیں **معلوم** ہوتی ہیں، یہ ہیں:

- کتاب کا مسودہ ۹۹۴ھ میں تیار ہو چکا تھا۔
- ۹۹۶ھ میں شیخ محدث نے حرمین شریفین کے سفر کا ارادہ کیا۔
- ۱۰۰۱ھ میں وطن واپسی پر مسودہ کو صاف کیا۔
- مسودہ صاف کرنے کے عمل میں خواجہ معین الدین چشتی سے لے کر شیخ نظام الدین اولیا کے خلفا، نیز ان کے خلفا کے خلفا اور بعض متاخرین کے حالات نقل کیے۔
- ماخذ میں مشائخ کے ملفوظات اور دیگر کتب و رسائل شامل تھے۔ معاصرین کے حالات کے لیے اپنے مشاہدات اور سماعی روایات سے کام لیا۔
- چونکہ کتاب میں ہر مشرب و مسلک اور مختلف احوال و مقامات کے حامل بزرگوں کا ذکر ہوا ہے، ان کے حالات کے مطابق لا محالہ مصنف کا اسلوب تحریر بھی بدلتا رہا۔
- مصنف نے اپنے دستخطی مسودے میں کتابت کا یہ انداز رکھا کہ کتاب میں درج مقتدا، مشہور اور صاحبِ سلسلہ بزرگوں کے نام سرخ روشنائی سے لکھے اور ان کے مریدوں اور پیروکاروں کے ناموں کو نمایاں کرنے کے لیے اوپر سرخ لکیر کھینچ دی۔

* * *

---

[۴] اخبار الاخیار کے بعض مطبوعہ نسخوں کے خاتمے میں حضرت مجدد الف ثانی کے حالات میں اڑھائی صفحے کا ایک اضافہ ملتا ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے دوٹوک الفاظ میں اس خاتمے یا اضافے کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا اخبار الاخیار یا اس کے مصنف سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس جگہ پر بالکل غیر موزوں ہے۔ یہ اضافہ بقلم شیخ محدث نہیں بلکہ کسی اور شخص نے کر دیا ہے (حیات شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۱۹۷)

خاتمۃ الکتاب (دوم) اخبار الاخیار

[بہ قلم شیخ عبدالحق محدّث دہلوی]

۔۔۔تسوید این مجموعہ در حدود سنہ اربع و تسعین و تسعمائۃ بود و بعد از قصد سفر مبارک حرمین شریفین ۔زادھما اللہ تعظیما و تشریفا۔ در سنہ ست و تسعین [کذا:+ و تسعمائۃ] و عود بہ وطن مالوف در سنہ احدی و الف بأمر من وجب عليَّ امتثال أمره العالي از ظلام سواد بہ نور بیاض و احوال متقدمین از خواجہ معین الحق والدّین تا خلفای شیخ نظام الدین ۔قدس اللہ اسرارهم۔ و اکثری از خلفای خلفای ایشان و اکثری از طبقہ کہ متصل هست بدان و بعضی متاخران، از ملفوظات و [کتب و ۔۔۔] رسایل منقول شده و احوال بسیار از درویشان عصر و صلحای وقت و قریب آن بہ سماع و مشاهده نوشتہ آمد۔ و اسامی جماعت کہ متبوع و مشهور و مقتدا و صاحب سلسلہ اند بہ حمرت ثبت یافتہ و نام های دیگران از مریدان و تابعان ایشان هم خط سرخ بران کشیده شده و چون هر کدام در احوال و مقامات و فضائل و کمالات و مشارب و مذاهب مختلف و متفاوتند، لاجرم اسلوب سخن هر جا بہ رنگی دیگر آمده۔ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ۔ امید کہ بہ نظر عنایت منظور و بہ سمع رضا مسموع گردد۔ انہ انہ [کذا] قریب مجیب و صلی اللہ علیہ وسلم و بارک و کرم علی سید و مولانا محمد و آلہ اجمعین۔

ترجمہ خاتمۃ الکتاب

اس کتاب کا مسودہ تقریباً نوسو چورانوے [۹۹۴ ہجری] میں تیار ہوا تھا۔[نوسو] چھیانوے میں حرمین شریفین- زادھما اللہ تعظیما و تشریفا- کے مبارک سفر کے قصد کے بعد اور ایک ہزار ایک [۱۰۰۱ھ] میں وطن مالوف واپسی کے بعد،اُن کے حکم پر جن کے حکم عالی کی بجاآوری میرے لیے لازم ہے، مسودہ کو صاف کر کے لکھا۔ متقدمین میں سے خواجہ معین الحق والدّین کے حالات شیخ نظام الدین- قدس اللہ اسرارھم-،اور ان کے خلفا کے اکثر خلفا اور ان سے متصل طبقہ میں سے اکثر اور بعض متاخرین کے حالات مجموعہ ہائے ملفوظات اور دیگر کتب و رسائل سے نقل کیے۔اپنے قریبی زمانے کے بہت سے درویشوں اور صلحائے وقت کے حالات سن کر اور دیکھ کر لکھے۔جن لوگوں کا اتباع کیا گیا اور جو مشہور، مقتدا اور صاحبِ سلسلہ ہیں ان کے نام سرخی سے لکھے ہیں اور دیگر لوگ جو ان کے مرید اور تابعی ہیں ان کے ناموں کے اوپر سرخ لکیر کھینچ دی ہے۔چونکہ ان میں سے ہر کوئی اپنے احوال، مقامات، فضائل، کمالات، مشارب اور مذاہب میں ایک دوسرے سے مختلف ہے، اس لیے میرا اسلوب سخن بھی ہر ایک کے معاملے میں مختلف رنگ میں ہے۔ قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ

مَّشْرَبَهُمْ (البقرہ:۶۰)۔امید ہے [میری یہ بات] نظر عنایت سے منظور ہوگی اور سمع رضا سے سنی جائے گی۔انہ قریب مجیب۔ و صلی اللہ علیہ وسلم و بارک و کرم علی سید و مولانا محمد و آلہ اجمعین۔
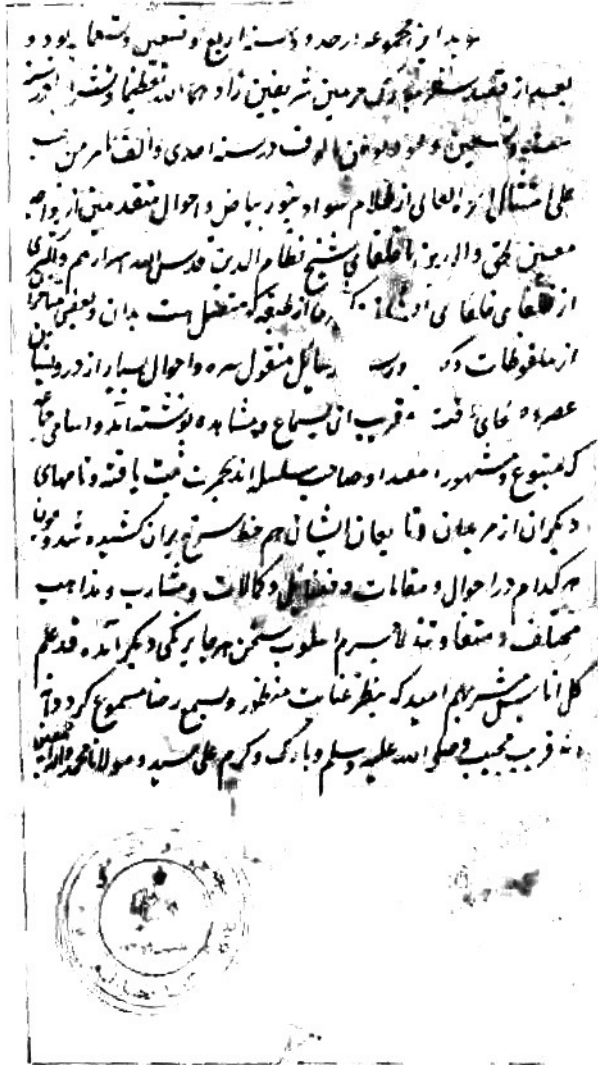
خاتمہ اخبار الاخیار، کتب خانہ مجلس شورائے اسلامی تہران، شمارہ ۱۰۵۸۸

اخبار علمیہ

برطانیہ میں ایشیائی، ہندوستانی زبانیں روبہ زوال

برطانیہ اور ہندوستان میں تجارتی معاہدہ اور انڈوپیسیفک جھکاؤ کے باوجود ہندوستانی زبانوں میں نمایاں کمی آئی ہے۔ یوکے کے شعبۂ تعلیم نے تصریح کی ہے کہ گزشتہ سات سالوں میں جنوبی ایشیائی زبانوں میں برطانیہ میں ۱۶ سال کی عمر میں لیے جانے والے قومی امتحان جی سی ایس ای میں بیٹھنے والے طلبہ کی تعداد میں زبردست کمی کو ظاہر کرتی ہے۔ ۲۰۲۲ء، ۲۰۲۱ء اور ۲۰۱۹ء میں جی سی ایس ای میں کوئی طالب علم نہیں بیٹھا۔ ۲۰۱۵ء میں صرف ۱۹ طلبہ ہندی جی سی ایس ای میں بیٹھے تھے۔ بہت سے لوگوں نے قابل اور تربیت یافتہ اساتذہ کی کمی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیبر ہیر و ویسٹ کے ایم پی گیر تھ تھامس کلیدی جنوبی ایشیائی زبانوں کے لیے وقف فنڈنگ اور اساتذہ کی ماہرانہ تربیت کے ساتھ ساتھ کمیونٹی اسکولنگ کے لیے مزید حکومتی سرمایہ کاری کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ تجارت کو فروغ دینے، کاروبار کے مواقع فراہم کرنے اور ہماری اجتماعی سلامتی کو بہتر بنانے میں مدد کرنے کے لیے جنوبی ایشیا کے لوگوں اور ایسے نوجوانوں کو جوڑنے کی ضرورت ہے جو ہماری اپنی زبانوں میں بات کرنے کے قابل ہوں۔ انہوں نے مزید کہا کہ ایسا کرنے کے لیے سرمایہ اور عزم وحوصلہ کی ضرورت پڑے گی۔ بنگالی جی سی ایس ای میں بیٹھنے والے طلبہ کی تعداد ۲۰۱۵ء میں ۸۹۰ سے کم ہو کر ۲۰۲۲ء میں ۴۲۵ رہ گئی ہے۔ یعنی ۵۲ فیصد کمی آئی ہے۔ گجراتی طلبہ کی تعداد ۲۰۱۵ء میں ۵۳۲ تھی جو گھٹ کر ۲۰۲۲ء میں ۱۹۷ ہو گئی یعنی ۶۳ فیصد کمی آئی ہے۔ ۲۰۱۵ء میں اردو طلبہ کی ۴۱۸۷ تھی جو ۲۰۲۲ء میں ۳۲۸۴ ہو گئی ہے۔ یعنی ۲۱ فیصد کی کمی ہوئی۔ فارسی کی تعداد ۳۹۵ سے گر کر ۳۱۹ پر یعنی ۱۹ فیصد کی کمی ہوئی ہے۔ سب سے کم زوال پذیر ہونے والی زبان پنجابی ہے جو ۸۰۵ سے گر کر ۷۱۴ پر آگئی ہے۔ کیمبرج انٹرنیشنل اگزامنیشن کی کنسلٹ ارونا اجسٹیریا کے مطابق معیاری ہندی جی سی ایس ای کا امتحان اس لیے واپس لے لیا گیا کیونکہ ایجوکیشن اتھارٹی کو اطمئنان بخش اندراجات یا داخلے نہیں ملے۔ بنگالی اور گجراتی اب بھی برمنگھم اور لیسٹر جیسی جگہوں میں پر لوگوں کی مانگ کی وجہ سے مرکزی دھارے کے اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ لیکن برطانیہ کے کسی بھی اسکول میں ہندی نہیں پڑھائی جاتی۔ یہ قومی نصاب میں بھی شامل نہیں ہے۔ نجی ہندی اسکول کی استانی اندو باروٹ نے کہا کہ وہ دس سال سے برطانیہ میں ہندی اسکول کی ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ (ٹائمز آف

انڈیا، وارانسی، ۷انومبر ۲۲ء ص ۱۴)

زمین کا مقناطیسی میدان خوف ناک آواز پید کر رہا ہے

یورپی اسپیس ایجنسی (ای ایس اے) کے سائنس دانوں نے ایک آڈیو جاری کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح زمین کا مقناطیسی میدان جو انسان کو تابکاری اور شمسی شعلوں سے تحفظ فراہم کرتا ہے ہولناک آوازیں نکال رہا ہے۔ڈنمارک کی ٹکنیکل یونیورسٹی کے سائنس دانوں نے ای ایس اے کے مصنوعی سیاروں کے جھرمٹ سے ناپے جانے والے جادوئی سگنلز کو آواز میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ ڈراؤنے خوابوں کی طرح لگتا ہے۔ایسا (ای ایس ای) کا کہنا ہے کہ پانچ منٹ کی آڈیو میں کریکنگ اور گہری سانس لینے کی آوازیں شامل ہیں۔یہ ہمیں یاد دلانے کا ایک انوکھا طریقہ تھا کہ مقناطیسی میدان موجود ہے اور زمین پر زندگی کا وجود اسی پر منحصر ہے۔ڈنمارک کی ٹکنیکل یونیورسٹی سے وابستہ موسیقار اور اس منصوبہ کے حامی کلاؤس نیلسن کی وضاحت کے مطابق ٹیم نے ایسا کے سوارم سٹیلائٹس کے ساتھ ساتھ دوسرے ذرائع کے ڈیٹا کا استعمال کیا اور مقناطیسی میدان کے مرکز کی نمائندہ آوازوں کو قابو میں کیا۔۲۰۱۳ء میں لانچ کیے گئے ای ایس اے کے تینوں مصنوعی سیاروں کو یہ سمجھنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے کہ ہمارا مقناطیسی میدان ان مقناطیسی سگنلوں کی درست پیمائش کے ذریعہ کیسے پیدا ہوتا ہے جو نہ صرف زمین کے مرکز بلکہ پردے، پرت اور سمندروں کے ساتھ ساتھ بعض دوسرے مقامات سے بھی نکلتے ہیں۔سیاروں کی پرہجوم بھیڑ موسم کی موسم کے باب میں نئ دقت نظر کا باعث بھی بن رہی ہے۔انہوں نے مزید کہا کہ ہم نے کوپن ہیگن کے سولبجرگ اسکوائر پر زمین میں کھدے ہوئے ایک بہت ہی دل چسپ ساؤنڈ سسٹم تک رسائی حاصل کر لی ہے۔ہم نے اسے ترتیب بھی دیا ہے تاکہ ہر اسپیکر زمین پر ایک مختلف مقام کی نمائندگی اور یہ ظاہر کرے کہ پچھلے ایک لاکھ برسوں میں ہمارے مقناطیسی میدانوں میں کس طرح اتار چڑھاؤ آیا ہے (ٹائمز آف انڈیا، وارانسی، ۳۰نومبر ۲۲ء ص ۱۲)۔

ک، ص اصلاحی

تلخیص و تبصرہ

تعلیم: ایک نقطۂ نظر

کلیم صفات اصلاحی

تعلیم کی اہمیت و ضرورت اور اس کی افادیت و مقصدیت پر ایک اہم، فکر افروز اور مفید مضمون کی تلخیص قارئین معارف کی خدمت میں پیش ہے۔ اس میں جدید تعلیم کے حصول کے مقاصد پر درپردہ تنقید کی گئی ہے۔ یہ مضمون تعلیم سے دلچسپی رکھنے والوں کو نئے سرے سے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ مترجم

سقراط نے کہا تھا ''میں ایک دائی کی طرح ہوں۔ جو کچھ تم میں چھپا ہوا ہے میں اسے سامنے لاؤں گا''۔ یہ تعلیم کی بہت موزوں تعریف ہے۔ خوش قسمتی اور بد نصیبی دونوں انسان میں پوشیدہ ہیں۔ اس میں امرت (آب حیات) اور زہر دونوں موجود ہے۔ خدا اور جانور دونوں اس میں بستے ہیں۔ یہ انسان کو آزادی دیتی ہے وہ جو بننا چاہے اسے چن لے۔ صحیح قسم کی تعلیم وہی ہوگی جو اسے خدائی کا راستہ دکھائے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جب انسان بہتر زندگی کے حصول کے لیے کوشش نہیں کرتا تو وہ خود بخود جانوروں سے بھی نیچے گر جاتا ہے۔ اس طرح کے زوال کے لیے انسان کا پیدا ہونا ہی کافی ہے۔ یہ (یعنی اس زوال کی طرف جانا) ہمیشہ آسان ہے۔ اس (عروج) کے لیے کام اور اپنے آپ کو مستقل استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے ہمت اور عزم چاہئے۔ اوپر کی طرف اٹھنا زندگی کا سب سے بڑا فن ہے۔ مستند تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ یہ فن سکھایا جائے۔ تعلیم کا مقصد خود زندگی ہونا چاہئے نہ کہ محض روزی روٹی کمانے کے لیے تعلیم کا حاصل کرنا۔ اپنے آپ میں اس کا کوئی مطلب نہیں ہے۔ اسے اکثر تعلیم کا مقصد سمجھ کر غلط کیا جاتا ہے۔ ایک انسان کی تلاش معاش کا مقصد صرف اپنے جسم کی بقا ہے اور تعلیم تب ہی زندہ رہے گی جب وہ خود زندگی سکھائے۔ زندگی سکھانا خود کو علم سکھانا ہے۔ ایک انسان بہت سی چیزوں کو جانتا ہے لیکن اگر وہ خود اپنے وجود سے ناواقف ہے تو اس کے تمام علم کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس علم کا کیا فائدہ جس کا مرکز نفس ہی نہ ہو۔ اگر نفس تاریکی میں ہو تو تمام لفظوں کی روشنی بیکار اور از کار رفتہ ہے۔ شعور کی طرف عروج کے لیے پہلا قدم خود شناسی کی سمت میں ہونا چاہئے۔ انسان جس حد تک اپنے آپ کو جاننے لگتا ہے اسی حد تک اس کی حیوانیت کا زوال ہوتا ہے۔ خود شناسی کا کمال یہ ہے کہ انسان کو معرفت خدا حاصل ہو (یعنی اس میں

خداشناسی کی صفت پیدا ہو)۔ صرف اسی جذبہ میں اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ ہر انسان اعلیٰ ترقی کا بیج اپنے اندر رکھتا ہے اور جب تک ان بیجوں کو فرٹیلائزڈ (یعنی بویا) نہیں جائے گا وہ بنجر رہے گا۔ اس کی حالت زمین میں بوئے گئے بیجوں کے برعکس نہیں ہے۔ جب ان کو پانی پلایا جائے اور کاشت کی جائے تب ہی وہ پھوٹتے ہیں، تب ہی وہ مٹی سے چھلکتے ہیں اور سورج کی روشنی تک پہنچتے ہیں اور اضطراب و بے چینی کا احساس جو بوائی اور فصل کی کٹائی کے درمیان موجود ہوتا ہے ایک بہترین علامت ہے۔ کیونکہ اس تکلیف واضطراب کے بعد ہی امن وسکون آسکتا ہے اور تعلیم نوجوانوں میں بے چینی کے اس زخم بھرے وقت کو تیز کرسکتی ہے۔ جب تعلیم حقیقی علم اور حقیقی امن کی طرف بڑھے گی تو ایک نیا انسان اور نئی انسانیت جنم لے گی۔ اسی پر ہمارے مستقبل کا انحصار ہے۔ بنی نوع انسان کی تقدیر تعلیم کے ہاتھ میں ہے۔ اگر انسان کو خود کو اپنے آپ سے بچانا ہے تو ضروری ہے کہ اسے از سر نو تشکیل دیا جائے۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو انسان میں موجود جانور اسے تباہ کر ڈالے گا۔ اس ڈراؤنے خواب سے بچنے کا واحد راستہ بنی نوع انسان کے لیے خود کو خدا میں مستحکم کرنا ہے۔ (ٹائمز آف انڈیا، وارانسی ایڈیشن۔ ۲۲-۷-۲۲ء ص ۱۰)۔

کائنات آٹو پائلٹ نظام کے تحت چل رہی ہے

اس میں مضمون نگار نے خدا اور کائنات کے متعلق ویدانت فلسفہ کی وضاحت کی ہے۔ اس کے مطابق کائنات کا نظام خدا نہیں آٹو پائلٹ (خود کار) نظام کے تحت چل رہا ہے۔ بنیادی طور پر یہ تصور اسلام کے خلاف ہے۔ اسلام کے مطابق اس خود کار نظام کا اصل خالق خدا ہے اور اس نے کائنات کو چلانے کے لیے ایک غیر مرئی مخلوق فرشتوں کی تخلیق کی ہے جو ہمہ وقت اس کی سخت نگہ داشت اور نگرانی میں اس کے حکموں کی بجا آوری میں لگے رہتے ہیں۔ مضمون نگار نے اسی میں آگے عقیدۂ شرک کی سائنٹفک توجیہ اور اس کا اثبات کرنے کی کوشش بھی کی ہے لیکن بعض باتیں اسلامی فلسفہ کے مطابق بھی ہیں۔

روحانیت بنیادی سوالات کے جوابات کی تلاش ہے۔ جیسے ایشور کون ہے؟ خدا اور یہ دنیا کیا ہے؟۔ ویدانت کے فلسفہ میں اس کی وضاحت موجود ہے۔ خدا کو دنیا کا خالق، کنٹرولر اور تباہ کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ یہ عالمگیر شعور اور جسم کا مجموعہ ہے۔ لیکن ویدانت کے فلسفہ کے مطابق خدا کا جسم کائنات کا اندرونی جسم ہے جسے پراکرتی، فطرت کہا جاتا ہے۔ یہ فطرت ہے جس سے برہمن (خدا) کا شعور جھلکتا ہے جو خود کار طریقہ سے ظاہر ہونے والی تخلیق کو قابو میں کرتا ہے۔ اسی برہمن کو ایک فرد کے تناظر میں آتما

(روح) کہا جاتا ہے۔ خدا آسمان پر بیٹھ کر کائنات چلانے والا نہیں ہے۔ یہ ایک آٹو پائلٹ (خود کار) نظام ہے۔ جو حرکت میں ہے، جس کے واضح نتائج مخصوص عمل سے نکلتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر آم کے بیج بوتے ہیں تو اس سے آم ہی آتے ہیں۔ نارنگی، سنترہ نہیں۔ یہ قدرت کا ایک مکمل اصول ہے۔ اس میں کرم (عمل) کا قانون شامل ہے۔ جس کے مطابق اس کے کئے کا نتیجہ ملتا ہے۔ اس کے اعمال کے مطابق نتائج بر آمد ہوتے ہیں۔ فطرت کے طور پر خدا کا تصور کرنا مشکل ہے۔ اس لیے ہم رام، کرشن، اللہ اور عیسیٰ جیسے الٰہی نام دیتے ہیں اور مختلف شکلوں میں اس کی پوجا کرتے ہیں۔ چونکہ پوری پراکرتی (فطرت) خدا کا مظہر ہے۔ کوئی بھی فطرت کی کسی بھی چیز کو اٹھا کر اس کی پوجا کر سکتا ہے۔ یہ ہندومت میں ۳۳۰ ملین دیوتاؤں کی پوجا کی وضاحت کرتا ہے۔ فطرۃً خدا غیر مشکل ہے۔ حقیقت میں خدا ہم میں سے ہر ایک کے اندر بیٹھی دنیا کو کنٹرول کر رہا ہے اور فطرت کے ہر حصہ میں ایک پوشیدہ شکل میں مقیم ہے۔ ایک پجاری مندر کے بر آمدہ میں بت کی طرف پیر کر کے سو رہا تھا۔ ایک شخص نے اس کو خدا کی توہین کے لیے ڈانٹا۔ اس نے جواب دیا۔ کیا آپ وہ سمت بتا سکتے ہیں جس میں خدا موجود نہیں ہے؟۔ میں اپنے پیر اسی طرف رکھوں گا۔ اس شخص کو جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا اور اس نے بابا سے معافی مانگی۔ دنیا تجربہ کا ایک میدان ہے۔ جسے خدا نے اپنے کرم (کام) کو ختم کرنے میں مدد کرنے کے لیے بنایا ہے۔ دنیا ایک مکمل طور پر فرنشڈ رہائش کی طرح ہے جس میں کچھ قیدی اپنے نتیجۂ عمل سے لطف اندوز ہونے یا اس کا شکار ہونے کے لیے ہیں۔ دنیا قدرتی نباتات اور تمام مخلوقات پر مشتمل ہے۔ کچھ لوگ جن کے پاس اچھے عمل ہیں وہ اس دنیا سے لطف اندوز ہوتے ہیں جب کہ دوسرے تکلیف میں ہوتے ہیں۔ دنیا میں مصیبت ایسی چیز نہیں جسے خدا من مانی طور پر ختم کرتا ہے۔ یہ ہمارے کرم (عمل) کا نتیجہ ہے یا اس سے پہلے جنم کا۔ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی کے کرم سے خوشی یا تکلیف کا فیصلہ ہو جائے تو وہ قدرتی آفت کیا ہے؟ جس میں ہزاروں لوگ مبتلا ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب بھی تمام لوگوں کا اجتماعی عمل نتیجہ خیز ہوتا ہے تو ایسی آفت آتی ہے۔ اگر عمل ہماری زندگی میں ہر چیز کا فیصلہ کرتا تو کیا خدا سے دعا کرنے سے کوئی کام ہوتا؟۔ جواب ابھی باقی ہے۔ جس طرح سپریم کورٹ کے فیصلہ کے بعد جمہوری نظام کی صورت میں صدر کے پاس یہ اختیار ہے کہ وہ مجرم کو معاف کر دے اسی طرح اللہ تعالیٰ ہمیں معاف کر سکتا ہے۔ چاہے ہم نے کوئی بھی عمل کیا ہو۔ اس لیے کوئی بھی خدا پر بھروسہ اور اس سے رحم کی دعا کر سکتا ہے (ٹائمز آف انڈیا، وارانسی ایڈیشن۔ ۲۵ اگست ۲۲ء ص ۱۰)۔

تبصرۂ کتب

نقوش آگہی: از وارث ریاضی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، خوبصورت سرورق، صفحات ۳۳۲، قیمت: ۳۰۰روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲ اور علی گڑھ، پٹنہ کے مشہور مکتبے۔ موبائل نمبر: ۸۲۲۸۹۰۲۵۴۸

جناب وارث ریاضی کا نام علم و داب و شعر کی دنیا میں مشہور ہے اور معارف کے لیے تو ان کا نام ہر قاری کی زبان پر رہتا ہے، قدرت نے ان کو صوفیانہ مزاج اور فقیرانہ کردار کے ساتھ عالمانہ شان اور عارفانہ مقام عطا کرنے میں اپنی فیاضی کا مظاہرہ ہی کیا ہے۔ لوح و قلم کی پرورش میں ان کی سی استقامت کم کو نصیب ہوتی ہے۔ اب زیر نظر کتاب میں انہوں نے اپنے کچھ مضامین و مقالات، کچھ مکتوبات اور کچھ عقیدت مندوں اور اصحاب تعلق کے تاثرات کو یکجا کردیا ہے۔ مقالات آٹھ ہیں اور کسی ایک کے بارے میں بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ محض بھرتی کا ہے یا نفع میں کم ہے۔ مثلاً جگر مرادآبادی کی شاگردی کے متعلق ایک بات کہی گئی کہ وہ مولانا سیماب کے شاگرد تھے لیکن بعد میں انہوں نے داغ سے اصلاح لی جو شاید صحیح نہیں، اس بات کی تحقیق میں جو محنت کی گئی ہے وہ کمال کی ہے، انہوں نے سیماب سے اصلاح کی تردید کرتے ہوئے ثابت کیا کہ داغ سے اصلاح لینے کے جو مواقع جگر کو ملے اس میں شک کی کیا گنجائش ہے۔ پر لطف بحث زبان و بیان کے کیسے کیسے معاملات سے آشنا کرتی جاتی ہے۔ مولانا نظام الدین امیر شریعت کی شخصیت پر مضمون معلوماتی ہے لیکن ان کی شعر گوئی اور اس میں ان کی مہارت کا جائزہ شاید پہلی بار اتنی تفصیل سے لیا گیا۔ زیادہ تر مضامین معارف میں چھپ کر اہل علم کی پسند کا درجہ پا چکے ہیں، ان کو یکجا پانا اور پڑھنا اور بھی لطف دیتا ہے، مکتوبات کی دنیا میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی، جگن ناتھ آزاد، ف. س. اعجاز، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر ریاض الرحمن شروانی، خورشید اکبر، ابرار رحمانی، عطا عابدی وغیرہ کے نام خود اس حصہ کی اہمیت کو بیان کرتے ہیں۔ رشحات نقد و نظر کے تحت ریاضی صاحب کی کتابوں پر منتخب تبصرے ہیں، غرض افادی اور تعمیری ادب کی ایک دنیا نقوش آگہی کی مدد سے آباد ہوگئی ہے۔ ڈاکٹر غطریف شہباز ندوی نے صحیح لکھا ہے کہ یہ مجموعہ علمی تحقیقات سے مملو ہے۔ ادب وہی جو روحانی لذت سے آشنا کرے، یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہی ادب اس کتاب کی روح ہے۔ کتاب کا انتساب جس محبت کی روشنائی ہے اس کو ملاحظہ کرلیا جائے کہ ”دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ کے ترجمان معارف کے نام جس نے مجھے پرورش لوح و قلم کے جذبہ والہانہ سے سرشار کیا“۔

سبیل العارفین: از مولانا محمد اویس قاسمی اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۳۳۴، قیمت: ۱۰۰ روپے، پتہ: فرید بک ڈپو پرائیوٹ لمیٹڈ، ۲۱۵۸، ایم پی اسٹریٹ، پٹودی ہاؤس دریاگنج نئی دہلی۔۲

نام ہی سے ظاہر ہے کہ منزل مراد پانے کے لیے معرفت حق کے متلاشیوں نے ایک راہ تلاش کی، اسی راہ پر چلنے والوں کی باتیں، ان کے تجربے، ان کی حوصلہ مندیاں اور پھر ان کی کامرانیاں، ہمیشہ ان حضرات کی اتباع کرنے والوں کے لیے ہمت و حوصلہ کا سامان بنتی رہتی ہیں، اس کتاب میں فاضل مؤلف نے امت کے برگزیدہ اصحاب علم و معرفت کے احوال و اقوال جمع کرنے کی سعی مشکور کی، اس کے لیے انہوں نے کثرت سے کتابوں کا مطالعہ کیا اور پھر علم، ایمان، طاعت و محبت الٰہی، ارکان اربعہ، قرآن مجید کی عظمت، ذکر و دعا، شکر، دعوت، حق گوئی، جیسے موضوعات پر فضائل اخلاق کے متعلق عمدہ و پر اثر سبق آموز اقوال و حکایات نقل کر دیے۔ مجموعہ صحیح معنوں میں بقول مولانا محمد اعجاز اعظمی مرحوم روشنی کا ایسا مرقع ہے جس میں تعلیمات اسلامی کی دلآویزی جگمگا رہی ہے۔ اس طرح کہ انسان کا عقیدہ و کردار چمک اٹھے، ایک نیک مقصد کے لیے ایک بہت نیک اور معصوم صفت انسان کی یہ کوشش یقیناً لائق تبریک ہے اور ساتھ ہی یہ اپنے پڑھنے والوں کے لیے بہترین تحفہ ہے۔ (ع۔ص)

رشید حسن خاں کی غالب شناسی: ابراہیم افسر۔ کاغذ و طباعت عمدہ، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۳۳۶، ملنے کا پتہ: ابرہیم افسر، وارڈ نمبر-۱، سیوال خاص، میرٹھ (یوپی)۔ ۲۵۰۵۰۱ قیمت: ۲۵۰روپے۔ سن طباعت: ۲۰۲۰ء۔ موبائل نمبر: ۰۹۸۹۷۰۱۲۵۲۸ ای میل: ibraheem.siwal@cmail.com

غالب اردو کے سب سے مشہور و مقبول اور ایسے عظیم المرتبت شاعر ہیں جن کے متعلق آئے دن نئے نئے انکشافات ہوتے رہتے ہیں اور ان کی نثری و شعری خصوصیات اور ادبی پہلوؤں پر کام کا سلسلہ ایک مدت سے جاری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب شناسی اردو ادیبوں اور محققین کا بڑا پسندیدہ اور دل چسپ موضوع بن گیا ہے۔ معروف محقق رشید حسن خاں مرحوم بھی غالب کے مرتبہ شناسوں اور ان کے مداحوں میں ہیں۔ انہوں نے بھی اپنی تحقیقی و تدوینی دلچسپیوں کا رخ غالب کی جانب پھیرا اور رستخیز بیجا کے نام سے دستنبو کا اردو ترجمہ اور انشائے غالب و املائے غالب جیسی کتابیں ان کے نوک قلم سے نکلیں۔ اس منفرد موضوع پر کام کے بعد اگر یہ کہا جائے کہ اسی کی کوکھ سے ان کی غالب شناسی کا سب

سے بیش قیمت گوہر اور نمایاں ترین مظہر گنجینۂ معنٰی کا طلسم (اشاریہ دیوان غالب، جلد اول) منصۂ شہود پر آیا تو بے جا نہ ہوگا۔ کتاب کی ضخامت کے پیش نظر اس کو تین جلدوں میں شائع کرنے کا منصوبہ تھا۔ ہندوستان سے ابھی صرف جلد اول شائع ہو سکی ہے۔ مجلس ترقی ادب لاہور نے اس کا مکمل متن ایک ہی جلد میں شائع کر دیا ہے۔ اس کام پر انہوں نے اپنی عمر عزیز کے تقریباً ۴۵ سال انتہائی انضباط و یکسوئی سے صرف کیے اور دقت نظری اور باریک بینی سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کلام غالب میں ایک لفظ کتنی بار مفرد یا مرکب انداز میں آیا ہے اور ہر بار غالب نے اس کے الگ الگ معنی و مفہوم مراد لیے ہیں۔ اس کی دوسری مثال نظر سے نہیں گذری۔ حالانکہ ان کا یہ کارنامہ ان کی وفات کے بعد منظر عام پر آیا۔

زیر نظر کتاب میں پہلے ۵۰ صفحات پر محیط مرتب کا پر مغز مقدمہ ہے جس میں خاں صاحب کے سوانح کے ساتھ ساتھ ان کی غالب شناسی پر کتاب میں شامل مقالات اور دوسری تحریروں کا مجملاً تعارف کرایا گیا ہے۔ غالبیات پر رشید حسن خان اور پروفیسر حنیف نقوی کے درمیان مراسلت کی بحث نے مقدمہ میں جان ڈال دی ہے۔ اس کے بعد گنجینۂ معنٰی کا طلسم پر دو مقالہ ایک پروفیسر ظفر احمد صدیقی مرحوم اور دوسرا مرتب کتاب کے قلم سے ہے۔ عنوانات کی تفصیل اس طرح ہے۔ غالب فکر و فن، غالب کے خطوط۔ جلد اول، دستنبو کا اردو ترجمہ (رستخیز بے جا، ۱۲۷۴ھ/۱۸۵۷)، دیوان غالب-صدی ایڈیشن، غالب کے سلسلے میں تحقیق کے نئے امکانات، غالب سے متعلق کچھ مطبوعات، بہ سلسلۂ تدوین کلام غالب، غالب کے خطوط میں قواعد، زبان، تلفظ اور املا کے مسائل، یادگار غالب، قابل اعتماد متن کی تلاش، غالب، انشائے غالب کا خطی نسخہ، غالب اور صفیر بلگرامی، تحقیق غالب، حیات غالب کا ایک باب، غالب اور انقلاب ستّاون (پیش لفظ) انشائے غالب، املائے غالب، شرح طباطبائی، توضیحی اشاریہ غالب نامہ (پیش لفظ)۔ ان مقالات کے مطالعہ سے خان صاحب کی غالبیات پر دسترس کے ساتھ ساتھ اردو کے ادبی ولسانی مسائل پر ان کے کمال نقد و نظر کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خان صاحب اس موضوع پر نئے انداز سے سوچنے کے عادی تھے۔

خاں صاحب کا شمار اردو کے عظیم ناقدین و محققین میں ہوتا ہے۔ غالب پر ان کے کاموں کو اہل علم بڑی وقعت واہمیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ مرتب کتاب، خاں صاحب اور غالب پر ان کے تحقیقی وتدوینی کاموں سے متاثر ہیں۔ رشید حسن خان کی ادبی جہات، رشید حسن خان تحریروں کے آئینہ

میں، رشید حسن خاں کے انٹرویو، اردو املا مسائل اور مباحث (رشید حسن خان کے حوالہ سے) وغیرہ کتابیں ان کے اسی تاثر و عقیدت کے نتائج ہیں۔ زیر نظر کتاب میں مرتب نے رشید حسن خاں صاحب کے ان مضامین، تبصروں اور پیش لفظوں کو یک جا کرکے شائع کیا ہے جو غالب کی شخصیت، کلام، لفظیات اور املا وغیرہ سے متعلق ہیں اور وہ زیادہ تر غالب نامہ، سہ ماہی اردو ادب، آجکل، تحریک، نئی دہلی وغیرہ یا غالب پر مطبوعہ کسی کتاب کے صفحات کی زینت بن چکے ہیں۔ بعض مقالات پر مرتب کے توضیحی اور معلوماتی نوٹ نے کتاب کی قدر و قیمت میں بلاشبہ اضافہ کر دیا ہے۔ غالب کے سلسلہ میں تحقیق کے امکانات والا مقالہ خاں صاحب نے ۱۹۸۰ء میں لکھا تھا۔ اس مضمون پر مرتب کی جانب سے توضیحی نوٹ ہونا چاہئے تھا کہ رشید صاحب نے غالب پر تحقیق کے جن امکانات کی نشاندہی کی تھی اس ضمن میں یہ یہ کام آگے ہوا تو بہتر ہوتا۔ امشلہ، غاب، رسماجرا، عاشیہ بردار وغیرہ املائی غلطیوں کی جانب خصوصی توجہ کی ضرورت تھی۔ ص ۲۲۸ پر رہنی چاہئے کی رہنا چاہئے اور ۲۲۹ پر کمزور کی جگہ کمزوری ہونا چاہئے تھا۔

نقوش حیات محسن الامت عارف باللہ حضرت اقدس مولانا شاہ مفتی محمد عبداللہ پھولپوری صاحب:

مرتب: مولانا ابن الحسن قاسمی، زیر اہتمام، مفتی محمد احمد اللہ۔ کاغذ و طباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش۔ صفحات: ۲۴۰ ملنے کا پتہ: دفتر فیضان اشرف، مدرسہ اسلامیہ عربیہ، بیت العلوم، سرائمیر، اعظم گڑھ یوپی۔ قیمت درج نہیں۔ سن طباعت: ۲۰۲۰ء موبائل نمبر: درج نہیں۔ ای میل: baitululoom256029@rediffmail.com

بعض شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کو ان کے آباواجداد سے نسبت کا فائدہ و فخر حاصل ہوتا ہے اور شروع میں ان کے تعارف اور دینی و دنیاوی شہرت و عزت کو پر پرواز ان ہی کے ناموں سے ملتی ہے مگر بعد میں جب لوگ ان کے لیے عقیدت مندانہ فرش راہ ہوتے ہیں اور انہیں خود کوئی عزوجاہ اور مقام ملتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے پیچھے خود ان کی اپنی کڑی ریاضت و محنت اور مجاہدہ کا بڑا دخل ہے۔ مولانا مفتی عبداللہ پھولپوری مرحوم کا شمار ایسے ہی روحانی خلف الرشیدوں میں ہے جنہوں نے اپنے جدامجد مولانا عبدالغنی پھولپوریؒ کی یادگار بیت العلوم، سرائمیر کو اپنے علمی، تعلیمی، دینی، روحانی اور ملی افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت کی جولان گاہ بنایا۔ انہوں نے اس کو مدرسہ پایا لیکن اپنی عملی لیاقت اور انتظامی صلاحیت سے اس کو عظیم الشان دینی ادارہ کی شکل دے دی۔ یہ ان کا بڑا قابل قدر کارنامہ ہے۔ ان کی متاثر کن اور دلکش شخصیت میں شریعت و طریقت کا خوب صورت امتزاج نظر آتا تھا۔ دیوبند کے طبقۂ

علما میں ان کا بڑا اثر تھا۔ مولانا کی اعلیٰ ظرفی اور وسعت نظری کا اعتراف غیروں کا بھی تھا۔ مسلکی اختلاف سے دوری اور اتحاد ملت کے علم بردار تھے۔ ان کے حالات زندگی اس لائق ہیں کہ نئی نسل کی فکری بے راہ روی اور دین سے دوری کے ماحول میں ان کے سامنے پیش کیے جائیں تاکہ ان کے اندر اصلاح حال کی فکر پیدا ہو۔ نقوش حیات گرچہ کتاب المناقب ہے تاہم اس کا اہم مقصد نسل نو کی تربیت، ہدایت اور عبرت پذیری کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

مرتب نے مولانا کے بچپن سے وفات تک کے حالات، معمولاتِ اوراد واذکار اور کارناموں کو بڑے سلیقہ سے یک جا کر دیا ہے۔ مولانا سے اکتساب فیض کرنے والوں اور مریدین کی تعداد ہزاروں میں ہے لیکن کتاب میں خلفا کی تعداد ۲۳ اور مجاز صحبت کی ۴۵ لکھی ہے۔ (ص ۱۷۵ تا ۱۷۷) فیضان اشرف کے اداریہ سے ان کے ادارتی اور اس کے خاص کالم درس حدیث سے ان کے ذوق مقالہ نویسی کا اندازہ پہلے سے تھا۔ زیر نظر کتاب سے معلوم ہوا کہ مولانا نے زمانۂ طالب علمی میں سیرت کے موضوع پر تذکار خیر الاخیار کے نام سے ایک کتاب بھی تصنیف فرمائی تھی۔ کاش یہ سلسلہ جاری رہا ہوتا۔ وفات پر مشہور علما اور دانشوروں کے تاثرات اور آخر میں عربی، فارسی اور اردو میں تاریخ وفات نکالی گئی ہے اور دو مراثی بھی شامل ہیں۔ کتاب اپنے موضوع پر مفید اور لائق مطالعہ ہے

(ک۔ ص۔ اصلاحی)

ثانئ سہراب شورش کاشمیری: فکر وفن، از محمد مرسلین اصلاحی، کاغذ کتاب عمدہ، صفحات ۲۰۰، قیمت ۱۶۲ روپئے۔ ناشر: اصلاحی ہیلتھ کیئر فاؤنڈیشن، نئی دھلی، ۲۰۲۰ء

محمد مرسلین اصلاحی کا تعلق اعظم گڈھ کے ایک معروف گاؤں اساڑھا سے ہے۔ مشہور شاعر بسمل اعظمی کا تعلق بھی اسی بستی سے ہے۔ وہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے پروردہ ہیں، اس کے علاوہ عصری تعلیم میں ایم اے اور بی ایڈ بھی ہیں۔ فی الحال اعظم گڈھ کمشنری میں بحیثیت اردو مترجم خدمت انجام دے رہے ہیں۔ وہ اردو زبان وادب کے شیدائی ہیں اور شاعری بھی کرتے ہیں۔ سوشل میڈیا میں بھی فعال ہیں۔ انہیں شورش کاشمیری سے بہت عقیدت ہے۔ اس کتاب پر ڈاکٹر مظفر احسن اصلاحی مرحوم سابق ناظم تعلیمات مدرسۃ الاصلاح نے چند سطریں لکھی ہے، جو ''محمد مرسلین بہ تخلص یورشؔ'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں انہوں نے ان الفاظ میں ان کے اس کام کو سراہا اور حوصلہ افزائی کی ہے:

۔۔۔ان کی نگہ اپنے عہد کے مسلم و معروف زبردست انقلابی شخصیت کے حامل جناب شورش کاشمیری کے انقلاب انگیز کلام اور ان کے فکر و فن پر پڑی اور وسائل کی پروا کئے بغیر اس نوجوان نے ایک معلومات افزا ذخیرہ تیار کر کے بیسویں صدی کو سلام پیش کیا ہے۔اہل نظر اس کاوش کی قدر و قیمت متعین کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی اس نوجوان کی ادب پسندی اور ادب نوازی کی سرپرستی بھی فرما سکتے ہیں: کریں گے اہل نظر تازہ بستیاں آباد

مرسلین اصلاحی کی یہ باقاعدہ پہلی کتاب ہے۔انہوں نے مواد جمع کرنے کے سلسلے میں دل جمعی سے کام لیا ہے۔اس کتاب میں کل نو (۹) ابواب ہیں۔اور اس طرح شورش کاشمیری پر ایک خوبصورت مرقع تیار ہو گیا ہے۔ باب اول میں خاندانی برگ و بار ،اسلام سے شیفتگی۔ دوم میں مجلس احرار میں شمولیت، سیاسی بیداری،ایام قید، کچھ مرحوم یادیں۔ باب سوم میں تعریف ابیات نظم، صنف لطیف اور شورش، تن ہمہ داغ دار شد۔ چہارم میں نعت گوئی، حمدیہ کلام، طویل نظم، سانیٹ ،واسوخت۔ باب ششم میں شورش کی نظموں میں انداز تغزل ،شورش کی نثر نگاری، شورش کا تنقیدی رویہ ،شورش کی علامہ اقبال سے عقیدت۔ ہفتم میں قادیانیت کی دسیسہ کاریاں ،کارواں ختم نبوت۔ باب ہشتم میں سائمن کمیشن گاندھی جی آزادی اور مسلمان اور آخری باب نہم میں تذکرہ نویسوں کا اغماض،ایک بے خوف صدا ڈوب گئی، تجربہ کا حاصل ،آخری آرزو اور کتابیات شورش جیسے عناوین قائم کئے گئے ہیں۔ ''صنف لطیف اور شورش'' کے تحت مصنف کتاب کا انداز تحریر بطور نمونہ ملاحظہ کریں:

شورش صنف نازک کے تئیں جذبۂ ہمدردی رکھتے تھے اور عورتوں کی بدحالی پر نالہ زن تھے۔انہوں نے معصوم عصمتوں کو نیلام ہوتے دیکھا، غربت اور حالات کا شکار نازنین کو زرداروں کے دولت کدوں کی زینت بنتے دیکھا۔۔۔ان تاثرات کی جیتی جاگتی تصویر ان کی کتاب ''اس بازار میں'' بہت مشہور ہے، جس میں انہوں نے قحبہ خانے کے شب و روز کی زندگی کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔(ص ۶۲)

شورش کے تنقیدی رویہ کے متعلق اس کتاب میں یوں روشنی ڈالی گئی ہے: ''تنقید اصل میں کسی چیز کے عیوب و محاسن کو اجاگر کرنے کا نام ہے، یا نظم و نثر کے حسن و قبح سے ممتاز کرنے کا،ایک نقاد کے لئے ضروری ہے کہ وہ تنقید، اصل تنقید، ضرورت تنقید، مقصود تنقید اور اسلوب تنقید سے اچھی طرح واقف ہو''(ص ۱۳۴)۔ درحقیقت تنقید کو برائے تنقید برتنے کا سلیقہ آنا چاہئے ورنہ عام طور پر وہ تنقید تنقیص میں بدل جاتی ہے۔اس کتاب کی تیاری میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ شورش کاشمیری

کی جملہ تصانیف کے علاوہ چٹان کی قدیم فائلوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ لیکن کتابیات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی مشہور کتاب ''چہرے'' تک ان کی رسائی نہیں ہو سکی۔ یہ کتاب دارالمصنفین کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اگر اس کتاب تک بھی رسائی ہو جاتی تو کتاب کی اہمیت میں مزید افادیت پیدا ہو جاتی ،۔ حوالوں کے بغیر کوئی تحریر کتنی بے کیف معلوم ہوتی ہے اہل نظر سے یہ مخفی نہیں۔ اس ضمن میں اس جانب توجہ مبذول کرانا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پوری کتاب پڑھنے سے بھی کتاب کالاحقہ ''ثانئ سہراب''معلوم نہیں ہوتا۔ دیباچہ میں اس لقب کی وضاحت لازماً ہونی چاہئے تھی ۔اس طرح کے علمی کام میں جلد بازی کا مظاہرہ مناسب نہیں ہوتا۔ امید کہ آئندہ ایڈیشن میں اس طرح کی ساری کمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ہمیں ریختہ ویب سائٹ سے معلوم ہوا کہ یہ لقب مولانا ظفر علی خان مرحوم کا دیا ہوا ہے، جسے انہوں نے شورش کاشمیری کے انتقال پر اظہار عقیدت کرتے ہوئے یوں لکھا تھا: ''شورش سے جو میرا رشتہ ہے، وہ ازلی ہے میں وقت کا رستم ہوں، تو وہ ثانئ سہراب''۔ معارف ۱۹۵۷ء میں شورش کے بارے لکھا گیا تھا کہ ''وہ اس دور کے ظفر علی خاںؒ کہلانے کے مستحق ہیں''۔ واقعی یہ پیش گوئی ان کے حق میں درست ثابت ہوئی (فضل الرحمن اصلاحی)۔

وفیات

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی مرحوم

افسوس ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی بھی اس عالم فانی سے رخصت ہو گئے۔ قریب نوے سال زندگی کا بڑا حصہ ہندوستان ہی میں گزرا لیکن وقت آخر امریکہ میں آیا،انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اسلامی معاشیات پر چند اختصاصی ہستیوں میں سر فہرست کی حیثیت سے ان کی شناخت قائم ہوئی۔ تدریس ہو یا تصنیف وتالیف اور ترجمہ نگاری ہو، ان کے علم وفکر کا بنیادی اور مستقل مرکز اسلام کا علم معاشیات ہی رہا، امتیاز یہ تھا کہ یہ محض روایتی اور حاشیاتی مطالعہ و تحقیق تک محدود نہیں تھا بلکہ اس میں زمانہ کے جدید معاشی تغیرات کی تہہ تک رسائی اور خود جدید علم معاشیات کی نارسائی بھی شامل تھی۔ اسی امتیاز خاص نے ان کو فیصل ایوارڈ جیسے وقیع اعزاز کا مستحق قرار دیا۔

وہ مشرقی یوپی کے مشہور شہر گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۱ء سال پیدائش بتایا جاتا ہے۔ مکتب اور اسلامیہ انٹر کالج میں ابتدائی تعلیم کے بعد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ڈاکٹریٹ تک اعلیٰ تعلیم کے مدارج طے کئے۔ معاشیات شروع ہی سے ان کا پسندیدہ موضوع رہا، ڈاکٹریٹ کی سند بھی انہوں نے نظریہ نفع کے موضوع پر حاصل کی۔ درمیان میں یعنی قریب بیس سال کی عمر میں انہوں نے رام پور میں جماعت اسلامی کی ثانوی درس گاہ میں بھی تعلیم حاصل کی اور سرائے میر کے مدرسۃ الاصلاح میں بھی چند مہینے بعض نامور اساتذہ کی صحبت میں گزارے۔ اس طرح جو فکری خمیر اور ضمیر تیار ہوا اس میں جدید اور قدیم دونوں کا رنگ شامل ہو گیا۔ تعلیم کے بعد تدریس کا آغاز مسلم یونیورسٹی ہی سے ہوا ، جماعت اسلامی سے وابستگی کے ساتھ اس دور میں یہ تقرر آسان نہیں تھا، لیکن صلاحیتوں کا انکار اتنا آسان بھی نہیں، وائس چانسلر شاید اے. ایم. خسرو تھے جو خود بھی معاشیات کے بڑے ماہرین میں تھے۔ اس لیے جوہر کی قدر شناسی اور بھی آسان ہوئی۔ ۱۹۵۲ء کا ایک درس گاہ کا طالب علم ۱۹۷۷ء میں اسلامک اسٹڈیز کے صدر شعبہ کی مسند پر فائز ہوا۔ اس کے بعد بلند پروازی کے نئے آسمان سامنے آئے، سعودی عرب میں ان کو پروفیسری ملی اور ۱۹۸۲ء میں شاہ فیصل بین الاقوامی ایوارڈ سے نوازے گئے۔

زندگی کی اس ساری دوڑ دھوپ میں صرف ایک موضوع بلکہ ایک دھن ساتھ رہی اور وہ یہی کہ اسلام کے نظام زندگی میں جہاں بدنی عبادت سب سے نمایاں پہلو ہے، اسی کے ساتھ مالی پہلو کو جس

طرح قرآن مجید میں ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے، اس کی حقیقت، ماہیت اور دور جدید کے نظام سرمایہ میں ان کی ضرورت اور نافعیت کو عام کیا جائے۔ اس کے لیے انہوں نے اردو اور انگریزی میں مضامین نو کے گویا انبار لگا دیے۔ ریاست کا دائرہ عمل ہو، افکار ہوں، تدریس ہو، بنک کاری ہو، نظریہ ملکیت، انشورنس ہو، انہوں نے نہایت تدبر سے اور سب سے بڑھ کر نہایت سلامت روی سے اپنے مطالعہ کے نتائج کو پیش کیا، ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ معاصر اسلامی کتب فقہ کو مد نظر رکھتے اور جب یہ محسوس ہوتا کہ کسی مسئلہ کو جیسے انشورنس ہی ہے اس کی فنی بنیادوں کو پوری طرح سمجھا نہیں گیا یا اس کے اقتصادی کردار کا صحیح تجزیہ نہیں کیا جاسکا تب وہ اس موضوع پر قلم اٹھاتے، احتیاط کے اسی لحاظ کو سلامت روی سے تعبیر کرنا مناسب ہے کیوں کہ عموماً دیکھا گیا کہ نتائج کی پیش کش میں کبھی کبھی ایسے لمحات آجاتے ہیں کہ روایتی انداز فکر کی زبان کچھ نامانوس سی ہو جاتی ہے۔ صدیقی صاحب نے ہمیشہ اس کا لحاظ رکھا کہ بات سلیقے سے کہی جائے، مثلاً انشورنس پر ان کا مختصر رسالہ ہے، لیکن ان کا پیش لفظ بہت وقیع ہے جس میں انہوں نے کہا کہ عام طور سے جدید معاشی یا معیشتی نظریات واعمال کو مختلف خرابیوں سے پاک کرنے کے لیے اخلاقی اصولوں پر مبنی طریقہ کو اختیار کرنا فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ نئے طریقے کو قرآن وسنت میں معتبر مصالح کی روشنی میں جانچنے اور شریعت کے اصول ومقاصد کو معیار بنا کر پرکھنے کی جگہ عام طور پر فقہی اصول وضوابط کے مطابق فیصلہ کیا جاتا ہے اور پھر جائز وناجائز کا فیصلہ صادر کر دیا جاتا ہے۔ تحقیق اس امر کی ہونی چاہیے کہ نئے طریقے اور نئے معاہدے معتبر شرعی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بن رہے ہیں، یا ان کے دشمن ثابت ہو رہے ہیں۔ صدیقی صاحب کی تفہیم سے اختلاف کی گنجائش جا بجا ہیں لیکن بیان کی تعبیر سے کوئی جراحت نہیں پہنچتی۔

صدیقی صاحب کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی زبان کے وہ منتہی طالب علم نہیں تھے لیکن انہوں نے امام ابو یوسف کی کتاب الخراج کا ترجمہ جس مہارت اور سلاست سے کیا وہ حیرت انگیز ہی کہا جائے گا۔ پاکستان کے مکتبہ چراغ راہ سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہونے والا ایڈیشن ہمارے سامنے ہے۔ کتاب الخراج کے مضامین اپنی جگہ لیکن کتاب کا مقدمہ کمال کا ہے، زمانہ تصنیف کا تاریخی پس منظر مصنف کے سوانح حیات اور پھر کتاب کا تعارف، غضب کا ہے۔ علمانے اور خصوصاً طلبائے فقہ وفتاویٰ کے لیے پڑھنا ضرورت کے درجہ میں کہا جاسکتا ہے۔

اسی طرح سید قطب شہید کی کتاب العدالۃ الاجتماعیہ فی الاسلام کا ترجمہ انہوں نے اسلام کا نظام

عدل کے نام سے کیا۔ اس کا آغاز انہوں نے مدرسۃ الاصلاح میں کیا تھا۔ اس میں مدد کے لیے انہوں نے اپنے استاذ جلیل مولانا جلیل احسن ندوی کا خاص طور پر ذکر کیا۔ بعد میں یہی کتاب اسلام میں عدل اجتماعی کے نام سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کے مقدمہ میں انہوں نے سید قطب کے ذکر ہی کے تعلق سے اسلام کے نام پر بیان ہونے والی تحریکوں اور جماعتوں کے ساتھ خود مسلم ملکوں کے غیر اسلامی اور غیر انسانی رویوں کے اسباب اور ان کے حل کی جانب جس طرح توجہ دلائی ہے وہ ان کی بصیرت اور حالات شناسی کی بہترین مثال ہے۔ انہوں نے آخر میں یہی لکھا کہ کامیابی اور ناکامی کے پیمانے دنیوی نہیں اخروی ہیں، دنیا میں اسلامی نظام زندگی کا قیام، آخرت کی بھلائی کے لیے ہی مقصود ہے۔

ان کی ایک چھوٹی سی کتاب شرکت اور مضاربت کے شرعی اصول کے نام سے ہے، یہ مقالہ دراصل قسط وار ماہنامہ زندگی رامپور میں شائع ہوا تھا۔ بنکوں میں شرکت اور مضاربت کی بحث آج پہلے سے زیادہ ضروری اور حل طلب بن گئی ہے۔ ۱۹۶۸ء میں اس کتاب میں انہوں نے کہا تھا کہ نظام بنک کاری کی تنظیم نو کے لیے شرکت و مضاربت میں وہی رائیں، بنیاد ہونی چاہئیں جو مکاتب اربع کے درمیان متفق علیہ ہوں، البتہ جن امور میں خود قرآن و سنت نے کوئی متعین ضابطہ نہیں دیا ہے ان میں زمانے کے تغیر اور نئی نئی ضرورتوں کی وجہ سے دوسری تیسری ہجری کے فقہی احکامات کو من و عن قبول کرنے کی بجائے ان میں مناسب ترمیم و تبدیلی منشائے شریعت کے مطابق ہوسکتی ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ صدیقی صاحب کے معاشی نظریات پر قرآنی انداز فکر غالب تھا اور اسی سے ان کے خیالات کی قدر بڑھتی تھی، قرآن فہمی کا ایک ذریعہ ان کے لیے سید قطب شہید کا نظریہ مطالعہ قرآن مجید بھی تھا، انہوں نے جگہ جگہ فی ظلال القرآن کا ذکر کیا، مقالات لکھے تو باقاعدہ افادات سید قطب کے نام سے۔ یہ مقالات قرآن اور سائنس کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئے۔

ان کی کتابیں بعض تو اصالۃً انگریزی میں ہیں اور بعض کتابوں کو عربی ترکی فارسی سمیت متعدد زبانوں میں منتقل کیا گیا۔ کتابوں کے علاوہ انہوں نے اپنے نظریات کی حفاظت و اشاعت کے لیے اپنے تلامذہ کو بھی تیار کیا۔ ان میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالعظیم اصلاحی سب سے نمایاں ہیں۔

ادھر عرصہ سے ان کے متعلق بے خبر کا عالم تھا، تشہیر اور خود نمائی کی فضاؤں میں کیسے کیسے چہروں کی چمک ماند پڑ جاتی ہے۔ یہ آج کے معاشرہ کی تکلیف دہ حقیقت ہے، بر صغیر میں مولانا مودودی اور مولانا علی میاںؒ جیسی شخصیتوں نے جس ایوارڈ کی عزت بڑھائی، یقیناً صدیقی صاحب نے بھی اس صف میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل کیا۔ بین الاقوامی پیمانہ پر اسلامی معاشیات کو وقت کی

زبان میں سمجھانا جتنا مشکل کام تھا،اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کے ذریعہ آسان بنادیا۔ ضرورت ہے کہ ان کی کتابوں کا پھر سے مطالعہ کیا جائے، ان پر اظہار خیال ہو اور خود ان کی شخصیت کے اجزائی ترکیبی پر بھی نظر ہو اور اس کے لیے ان کے اور ان کے نام خطوط کا مجموعہ سب سے زیادہ کار آمد ہے، جس کو جمع کر کے انہوں نے اس کا نام اسلام، معاشیات اور ادب، خطوط کے آئینہ میں دیا تھا۔ عجب غضب کے یہ نامے ہیں۔ خدا جانے کیا کیا کہہ جاتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبولیت کا شرف بخشیں، ان کے درجات بلند ہوں اور ان کی خدمات کا نفع ان کے بعد بھی عام ہوتا رہے۔ آمین۔

پروفیسر سعید الظفر چغتائی مرحوم

افسوس ایک اور باکمال شخصیت نے علمی دنیا کے بڑھتے سناٹے کو اور بڑھا دیا۔ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ فزکس کے استاد پروفیسر سعید الظفر چغتائی نے بھی اس دنیا سے رخت سفر باندھ لیا۔ انا للہ۔

۱۹۳۶ء ان کا سال پیدائش ہے، وہ Atomic Spectra یعنی ایٹمی طیف کی تحقیق میں بین الاقوامی سائنسدانوں میں بڑا مقام رکھتے تھے۔ Optical Science میں انہوں نے اختصاص کیا تھا۔ پروفیسر عبدالسلام کے بعد خبریں آرہی تھیں کہ چغتائی صاحب کو ان کی تحقیقات کے اعتراف میں نوبل انعام کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ نوبل انعام کا اعلان تو نہیں ہوا لیکن دنیا میں ایک مسلم سائنسدانوں کی عظمت کا علم تو بہتوں کو ہو گیا۔ چغتائی صاحب کا ذکر یہاں اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ وہ فزکس کے ہوتے ہوئے بھی علوم مشرقیہ کے بڑے عالم بھی تھے۔ دارالمصنفین اور معارف سے خاص تعلق تھا۔ معارف میں ان کے کئی مضامین اور خطوط بھی شائع ہوئے۔ چغتائی صاحب تنہائی کے خوگر تھے، لوگوں سے خلا ملا بھی کم تھا۔ آج کی تعبیر میں سوشل بالکل نہ تھے، لیکن ان کی زندگی ایسی سپاٹ بھی نہ تھی، مولانا دریابادی، مولانا عبدالباری ندوی، ڈاکٹر حمید اللہ پروفیسر نذیر احمد جیسے مشاہیر سے ذاتی تعلقات اور اقبال و فیض سے روحانی و فکری اشتراک نے ان کی شخصیت کو غیر معمولی کشش عطا کر دی تھی۔

گورکھپور، علی گڑھ اور سویڈن کی یونیورسٹیوں میں اور اٹلی کے اسلام بین الاقوامی مرکز برائے طبیعیات نظری میں وہ قدیم مسلم سائنسدانوں کی یاد کو تازگی اور زندگی عطا کرتے رہے، اور کمال یہ ہے کہ ان کی وفات کی خبر کسی اردو اخبار کا ایک گوشہ بھی نہیں پا سکی۔ مئی ۲۰۱۳ء کے معارف میں انہوں

نے اپنے نام ڈاکٹر حمید اللہ کے خطوط شائع کیے۔اس کی تعارفی تحریر خود ان کے علم و فضل کی گواہ ہے۔اس میں انہوں نے بتایا کہ ایک میز پر ڈاکٹر حمید اللہ کو سات آٹھ زبانوں میں گفتگو کرتے دیکھا اور سنا ہے۔

اب کیسے بتایا جائے کہ طبیعیات کے مضمون پر بلند ترین مقام پانے کے ساتھ خود چغتائی صاحب نے کتنی زبانوں پر دسترس حاصل کی، بال جبرئیل کے فرانسیسی ترجمہ کی توفیق یوں ہی نہیں ملتی۔

چغتائی صاحب کا وطن وہی دریاباد ہے جو مولانا عبدالماجد کے وجود سے در آباد بن گیا۔اودھ کے قدیم قصبات کی طرح یہاں بھی محلوں کے نام محلہ والوں کی نسبت سے رکھے جاتے جیسے مخدوم زادگان، چودھریان، میر دہان، اسی طرح محلہ مغلان بھی ہے جہاں چغتائی صاحب کے خاندان والوں کی ڈیوڑھی تھی، اب بھی اس کے کچھ نشان باقی ہیں، ان کے والد مرزا ناظر بیگ بڑے سادہ اور خاموش مزاج تھے۔اخبار بینی کے شوقین تھے۔چغتائی صاحب کا مقامی نام محمد احمد تھا، دریاباد کے سرکاری اسکول میں بھی وہ خاموش خاموش سے رہتے، شام کی مجلس میں مولانا دریابادی کی خدمت میں حاضر ہوتے۔لکھنؤ یونیورسٹی کے زمانہ تعلیم میں مولانا عبدالباری ندوی کے گویا وہ مرید تھے۔ نماز روزے کی پابندی دوسروں کے لیے حیرت کا سبب بن جاتی تھی، اعلیٰ تعلیم کے لیے پیرس پہنچے، ان کے مقامات بلند سے بلند تر ہو گئے، ایک ایٹمی سائنسداں کی خاموشی بھی عجب تھی کہ جب لب کشا ہوتی تو صرف شعر کے قالب میں نظر آتی، ان کے کئی شعری مجموعے ان کے سائنسی مقالات کے ساتھ ساتھ چھپتے رہے، خاموش زبان اور گہرے چشمے کے پیچھے بے چین سی آنکھوں نے زندگی کا ثبوت اس طرح دیا کہ ان کی ناول نما کتاب سحر کے پہلے اور بعد، ان کے زندگی کی کتنی گرہوں کو کھول گئی۔ان کا ایک مجموعہ کلام نے نوازی ہے جس نے اقبال سے ان کے کسب فیض کا پتہ دیا کہ ع مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی، شاعری کو وہ مشغلہ بے کاری نہیں سمجھتے تھے، لیکن یہ بھی کہتے تھے کہ شعر ہو یا نثر جو کچھ کہا بعض اوقات بہ طور اضطراری ہی کہا، مگر یہ محض جذبات نگاری ہی نہیں مشاہدات اور ان کو سمجھنے کی کوشش بھی ہے۔ایک فلسفی اور شاعر اور پھر سائنسداں اگر یہ کہے کہ ہماری دنیا میں فتنہ وفساد کے بڑے سبب دو ہیں، حرص وحسد اور تعصب، کہتے تھے کہ اس کا مفہوم شاید یہی ہے کہ ہم خود کو سب سے پہلے انسان نہیں مانتے۔یہ احساس زندگی کے اتار چڑھاؤ میں کبھی حادثہ کا شکار نہیں ہوا۔۱۹۵۵ء میں جب وہ نہایت عبادت گزار نوجوان مسلم تھے اس وقت بھی ان کی زبان پر یہ شعر تھا کہ

مجھے بخش دے وہ ظرف بادہ گساری
کہ پی جاؤں جتنا زمانے میں غم ہے

تلاش مسلسل، سعی دوام، محبت کا جذبہ ناکام، ان سب نے شاعر کو سائنسداں بنایا یا طبیعت کو فطرت سے ہم آہنگ کیا، اس کا جواب ان کا کوئی قریبی شناسا ہی دے سکتا ہے مگر اتنا اقرار تو خود ان ہی کا تھا کہ

اسی تلاش سے میری حیات قائم ہے
یونہی حیات یوں ہی کائنات قائم ہے

گذشتہ صدی کے نصف آخر کی عہد ساز ہستیوں کے شناسا، ایک غیر معمولی سائنسداں کی یاد کا جواز تلاش کیا جانا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کا معاملہ فرمائے۔

اہلیہ مرحومہ سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم

دو نومبر کو خبر ملی کہ دارالمصنّفین کے سابق ناظم اور معارف کے مدیر جناب سید صباح الدین عبدالرحمن کی اہلیہ کا پاکستان میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ محض ایک خاتون کا اس دنیا سے پردہ کر لینا ہی نہیں، قریب اڑتیس سال کی دارالمصنّفین کے احاطہ کی اندرونی زندگی کی داستان ختم ہونے کا وہ احساس ہے جس کا اندازہ احاطہ سے باہر کی دنیا کو شاید ہو ہی نہیں سکتا۔

دارالمصنّفین کی دنیا کا علمی و مذہبی رقبہ جتنا وسیع اور متنوع ہے خود مقامی طور پر اس ادارہ کی اپنی تہذیبی و ثقافتی شناخت اسے ایک نہایت خوش گوار احساس عطا کرتی رہی، اور اس میں دارالمصنّفین کے ذمہ دار مکینوں اور رفیقوں کی عائلی زندگی کا بڑا حصہ رہا۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے تک پورے شہر میں دارالمصنّفین کے وقار کی حفاظت اور بود و باش میں ایک خاص نفاست کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ جاننے والوں کا یہی کہنا تھا کہ خواتین دارالمصنّفین کی اس تاریخ میں مرحومہ کا بڑا حصہ رہا، ان کو "باجی" لفظ ایسا راس آیا کہ وہ اسی نام سے مشہور ہوئیں اور واقعہ یہ ہے کہ دارالمصنّفین کی عائلی زندگی میں دوسری خواتین کے لیے وہ بڑی بہن کی طرح واقعی خاندانی سرپرست سمجھی جاتی رہیں۔

وہ سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم کی پہلی بیوی کے انتقال کے بعد مرحوم کی زندگی میں داخل ہوئیں۔ یہ غالباً ۱۹۴۸ء یا ۱۹۴۹ء کی بات ہے۔ اسی سال صباح الدین عبدالرحمن کی پہلی تصنیف بزم تیموریہ بھی شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد بیسیوں کتابیں ان کے قلم سے نکلیں جن کے ناموں میں بزم اور جلوؤں جیسے الفاظ کے وجود میں باجی مرحومہ کے وجود اور تعاون کی جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔

دیسنہ کی خاک سے جن کی نمو ہوئی اور جس کے بابرکت ہونے کے لیے مولانا سید سلیمان ندوی کا نام ہی کافی ہے، باجی نے بھی اسی بستی میں ایسے خانوادے میں آنکھیں کھولیں جو مذہبی اور علمی شان کا حامل تھا، ان کے نانا مولانا سید عبدالصمد ندوی تھے جو شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی کے مرید حاجی اسماعیل کے فرزند تھے۔ باجی کے سر سے والد کا سایہ عاطفت و شفقت جلد ہی اٹھ گیا، گویا نانا ہی کی تربیت میں رہیں، اور اسی تربیت کے سہارے انہوں نے اپنی بیوہ ماں اور دو بھائیوں کی ذمہ داری کم عمری ہی میں بخوبی ادا کی، شوہر کی مصروف ترین زندگی میں انہوں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا بہترین نظام بنایا۔ چار بچوں میں دو بیٹیاں اور دو بیٹے ہیں اور سب کے سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ خاندان کے افراد زیادہ تر پاکستان منتقل ہو چکے تھے، صباح الدین صاحب کے انتقال کے بعد وہ بھی کراچی اس طرح گئیں کہ پھر واپس نہ آسکیں۔ دارالمصنّفین کے زمین و آسمان وقت کی گردشوں میں بدل سے گئے لیکن یہاں کے در و دیوار کو ہمیشہ اپنی باجی کا انتظار رہا۔ اب ان کی رخصتی اصل دار، دارالآخرہ کے لیے ہوگئی ہے۔ اللہ تعالیٰ حسنات طیبات کو قبول کرے اور ابدی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔

ادبیات

غزل

وارث ریاضی

موبائل نمبر: ۸۲۲۸۹۰۲۵۴۸

(حضرت نشور واحدی کی ایک غزل سے متاثر ہو کر)

ترے تصور میں کھو کے مجھ کو مذاقِ شعر و سخن ملا ہے
جنوں کو عقل و خرد ملی ہے ، خرد کو دیوانہ پن ملا ہے

کسی کو ظلم و ستم کی عادت، کسی کی فطرت میں خوئے نفرت
خدا کا بے حد کرم ہے مجھ پر کمالِ حُبِّ وطن ملا ہے

تلاش امن و اماں کی خاطر ، جہاں بھی پہنچا ہوں لو لگائے
تو مجھ کو ہر شہرِ آرزو میں ستم گری کا چلن ملا ہے

یہ کیسی منزل ؟ یہ کیسی راہیں ؟ یہ کیسے رہ بر ملے ہیں ہم کو ؟
کہ جن کی پُر کیف رہ بری میں ، بہ ہر قدم راہ زن ملا ہے

یہ رنج و غم جزوِ زندگی ہیں ، نجات اِن سے نہیں ہے ممکن
کہ روز اوّل سے آدمی کو یہ عالمِ پُر محَن ملا ہے

تری ادائے جفا نما کا فسانہ ہر اک زباں پہ جاری
تری گلی میں قدم قدم پر مقامِ دار و رسن ملا ہے

حسین صورت ، حسیں نگاہیں ، حسیں تبسم ، حسیں ادائیں
حسین اندازِ دل بری میں ، حسین پیماں شکن ملا ہے

نہیں ہے فرصت کسی کو دیکھے کہ کون کیسے لباس میں ہے ؟
کہ ہر بشر اِس جہاں میں وارث خود اپنی دُھن میں مگن ملا ہے

معارف کی ڈاک

(۱)

پروفیسر اصغر عباس مرحوم: علی گڑھ تحریک کے اداشناس

معارف (نومبر ۲۰۲۲ء) میں وفیاتی تحریروں کے تحت پروفیسر اصغر عباس مرحوم (م ۷، ستمبر ۲۰۲۲ء) کا ذکرِ خیر نظر سے گزرا۔ان کی شخصیت کے امتیازی پہلوؤں کے ساتھ ان کی علمی خدمات کے گوناگوں گوشے سامنے آئے۔ان سب کا ماحصل یہ ہے کہ سرسید و علی گڑھ تحریک ان کے مطالعہ و تحقیق کا اختصاصی میدان تھا۔ان کی تحریریں اس کی شاہد ہیں کہ انہوں نے سرسید مطالعات کو اپنی تصنیفی و تالیفی سرگرمیوں کا محور بنایا اور اس میدان کے لیے اپنی علمی صلاحیتیں وقف کر دیں اور اسی کی بدولت وہ ''سرسید شناس'' کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ معارف کے مرتبِ گرامی مولانا محمد عمیر الصدیق ندوی صاحب کا یہ تاثر مبنی بر حقیقت ہے کہ ''سرسید اور علی گڑھ کا ذکر ان کی علمی و تحقیقی زندگی کا سب سے بڑا عنوان ہے اور اسی کے ذیل میں فکر، مزاج، منہج اور مقصد سے وفاداری کے خدا جانے کتنے جلوے بکھرے نظر آتے ہیں''۔۱۹۶۶ء میں شعبۂ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پی ایچ۔ڈی مقالہ (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کا تنقیدی مطالعہ اور اردو صحافت پر اس کے اثرات) کی تیاری کے لیے انہوں نے مطالعۂ سرسید کا آغاز کیا تو وقت گذرنے اور تحقیقی کاموں کے آگے بڑھنے کے ساتھ اسی میدان میں ان کی علمی مصروفیات مرتکز ہو گئیں۔۱۹۷۶ء میں لکچرر کی حیثیت سے ان کی مستقل تقرری پر مبارک باد دیتے ہوئے نامور اسکالر اور سابق صدر شعبہ اردو ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پروفیسر رشید احمد صدیقیؒ نے اپنے تہنیتی مکتوب (مورخہ ۲۰، مارچ ۱۹۷۶ء) میں انہیں جو نصیحت آمیز کلمات تحریر کیے تھے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ''معنوی شاگرد'' نے علی گڑھ کی قدیم روایات کے امین و پاسباں کے اِن کلمات کو حرزِ جان بنالیا۔ وہ کلماتِ عالیہ یہ تھے: ''یوں تو یونیورسٹی اور ملحقہ اداروں میں کسی کو نوکری مل سکتی ہے اور ملتی رہتی ہے اور وہ جس طور پر اپنا نفع دیکھتا ہے اسی کے مطابق کام کرتا ہے۔آپ کو خاص طور پر مبارک باد دیتا ہوں کہ آپ کا مستقل سلسلہ علی گڑھ سے ہو گیا۔ محض اتفاقیہ یا کسی اور سبب سے نہیں، بلکہ کافی ریاض اور آزمائش سے گذرنے کے بعد۔اس لیے میں چاہتا ہوں کہ اپنے نفع کے ساتھ آپ مسلم یونیورسٹی اور جن کے لیے یہ یونیورسٹی قائم ہوئی ہے ان کی سود و بہبود کا برابر لحاظ رکھیں'' (ضیا بار افراد کے خطوط بنام اصغر عباس، علی گڑھ،

۲۰۲۰ء، ص۱۲۵)۔بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ پروفیسر اصغر عباس صاحب نے ان کلمات کو اپنی علمی زندگی کے لیے رہنما خطوط کے طور پر استعمال کیا اور یہ تصور دل و دماغ میں نقش کر لیا کہ سر سید کی تعلیمی، سماجی و ملی خدمات کو نمایاں کرنا نہ صرف ادارۂ سر سید کی خدمت کا ایک بہت اہم ذریعہ ہے، بلکہ ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے نقطۂ نظر سے بھی یہ کام افادیت سے خالی نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مرحوم نے اپنی تحریروں میں سر سید اور ان کے ادارہ کو یاد رکھنے اور اہلِ ہند بالخصوص مسلمانوں کی سماجی و تعلیمی اصلاح و ترقی کے لیے ان کی مساعیِ جمیلہ کو اجاگر کرنے کو اپنا مشن بنا لیا۔ اس میدان میں پروفیسر اصغر عباس مرحوم کا ایک خاص امتیاز یہ سامنے آتا ہے کہ انہوں نے اپنے پسندیدہ موضوع پر جو کچھ تصنیفی و تالیفی کاوشیں پیش کیں وہ سر سید، عہدِ سر سید اور علی گڑھ تحریک کے بنیادی مآخذ (علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ) کے گہرے مطالعہ پر مبنی تھیں۔ پروفیسر اصغر عباس صاحب سے متعلق ان کے استادِ مکرم و سابق صدر شعبۂ اردو گورکھپور یونیورسٹی پروفیسر محمود الٰہیؒ کا یہ تاثر معنویت سے خالی نہیں کہ "ڈاکٹر اصغر عباس صاحب کا شمار علی گڑھ تحریک کے اداشناسوں میں ہوتا ہے" (انتخابِ مضامین علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، مرتبہ اصغر عباس، لکھنؤ، ۱۹۸۲ء، ص۳، مقدمہ)۔ استاد کی جانب سے اپنے شاگرد کے علمی کاموں کی یہ قدر دانی خود استادِ محترم کی عظمت کا منہ بولتا ثبوت بھی ہے۔ بہر کیف شاگردِ عزیز کی یہ "اداشناسی" سر سید اور علی گڑھ تحریک پر متعدد بیش بہا کتب کی صورت میں بار آور ہوئی، جیسا کہ معارف کی پیشِ نظر وفیاتی تحریر میں بڑی خوش اسلوبی سے ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ سر سید پر مرحوم کی آخری علمی یادگار "شذراتِ سر سید" ہے۔ علی گڑھ میں سر سید اور شبلی کے قریبی و نتیجہ خیز روابط کی نسبت سے یہ واقعہ کچھ کم اہم نہیں ہے کہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے منتخب سر سید کی تحریروں کا یہ قیمتی مجموعہ علامہ شبلی کی زندہ و تابندہ علمی یادگار دار المصنفین شبلی اکیڈمی کے زیرِ اہتمام ۲۰۱۷ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اسے پروفیسر اصغر عباس صاحب نے اپنے ہمدمِ دیرینہ و سابق ڈائرکٹر دار المصنفین شبلی اکیڈمی پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب کی تحریک پر مرتب کیا تھا۔ "شذراتِ سر سید" کی یہ پہلی جلد تھی، جلد دوم کی ترتیب کا کام ابھی آگے نہیں بڑھا تھا کہ قضا و قدر کا فیصلہ آگیا اور مرتبِ گرامی ہمیشہ ہمیش کے لیے دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ بلاشبہ مرحوم کا مرتب کردہ (اور ۲۰۲۰ء میں مطبوعہ) ان کے نام ان کے احباب و رفقاء، اقرباء و اعزہ اور اساتذہ و تلامذہ کے خطوط کا مجموعہ (ضیا بار افراد کے خطوط بنام اصغر عباس) سر سید مطالعات سے براہِ راست تعلق نہیں رکھتا، لیکن اس کی ورق گردانی کرنے والے اس سے واقف

ہوں گے کہ اس مجموعہ میں شامل شاید ہی کوئی ایسا خط ہو جو سرسید، ادارۂ سرسید یا علی گڑھ روایات کے ذکر سے خالی ہو۔ خود مکتوب الیہ کے خطوط میں کس قدراِن شخصی و علمی یادگاروں کا تذکرہ ہوگا، اِس وقت اس کی وضاحت سے ہم قاصر ہیں، اس لیے کہ ان خطوط تک ابھی رسائی نہیں ہو سکی ہے، اللہ کرے اس کی کوئی سبیل نکل آئے۔ اللہ رب العزت محبِ گرامی پروفیسر اصغر عباس صاحب کو اپنی رحمت و مغفرت سے نوازے اور ابدی زندگی میں انہیں سکون و سرور مرحمت فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی
اسلام منزل، اقرا کالونی، علی گڑھ
zafarul.islam@gmail.com

(۲)

جناب زاہد جعفری صاحب کا مکتوب

اکتوبر ۲۰۲۲ء کا معارف بہت تاخیر سے ملا۔ جملہ مشمولات پسند آئے، لیکن جناب زاہد جعفری صاحب کا مکتوب محل نظر ہے۔ جعفری صاحب کے مکتوب سے معلوم نہیں ہوتا کہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سوا دوسرے صحابہ رضوان اللہ علیہم کو معیار حق یا بر سرِ حق سمجھتے ہیں یا وہ بھی صحابہ کرام کو تنقید سے بالاتر نہیں سمجھتے؟

معارف جولائی ۲۲ء میں محترم ڈاکٹر فدائی راہی صاحب کے شائع شدہ مکتوب کے حوالے سے جعفری صاحب نے لکھا ہے: ''اپنے مکتوب میں ڈاکٹر راہی فدائی نے ابن اسحاق کی شخصیت کو متضاد اور متنازع بتایا ہے۔ یہ تنقیدی انداز، جذبۂ تنقیص کی غمازی کرتا ہے'' (معارف اکتوبر ۲۰۲۲ء ص ۸۰۳)۔

محترم جعفری صاحب نے بہ ذات خود اپنے مکتوب میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ امام نسائی، امام مالک، محدث دار قطنی، امام مکی اور یحیٰی بن قطان وغیر ہم نے محمد بن اسحاق پر جرح و تنقید کی ہے۔ حضرت زید بن حارثہ کو عربوں نے حدود شام میں شہید کر دیا تھا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حضرت زیدؓ کا انتقام لینا چاہتے تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے آغاز علالت سے ایک روز پہلے حضرت اسامہ بن زیدؓ کو اپنے باپ کا انتقام لینے پر مامور کیا۔ لیکن واقدی اور ابن اسحاق کا بیان ہے کہ اس غزوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمر کو بھی جانے کا حکم دیا تھا۔ اس سلسلے میں علامہ سید سلیمان ندوی نے واقدی اور ابن اسحاق کی روایتوں کو بے سند قرار دیا ہے (سیرت النبی جلد دوم ص ۱۸۲)۔

علامہ شبلی نعمانیؒ نے تحریر فرمایا ہے:

متفق علیہ روایت یہ ہے کہ آپ ﷺ کے چھ اولادیں تھیں:

قاسمؓ، ابراہیمؓ، زینبؓ، رقیہؓ، ام کلثومؓ (اور) فاطمہؓ.... لیکن ابن اسحاق نے دو صاحب زادوں کا اور نام لیا ہے: طاہر (اور) طیب (ایضاً ص ۴۶۸)

علامہ شبلی نے ابن اسحاق کی روایت کو مسترد کرتے ہوئے صرف حضرت قاسمؓ اور حضرت ابراہیمؓ کو آپ ﷺ کی اولاد ذکور میں شمار کیا ہے (ایضاً ص: ۴۶۸تا۴۷۹)

جب مذکورہ ائمہ احادیث وفقہ نے ابن اسحاق پر جرح وتنقید کی ہے اور مولانا سید سلیمان ندویؒ اور علامہ شبلیؒ نے بھی ابن اسحاق کی بعض روایتوں کو بے سند قرار دے دیا ہے تو ایسی صورت میں اگر ڈاکٹر راہی فدائی جیسے مستند محقق نے ابن اسحاق کو متضاد اور متنازع شخصیت کا حامل کہہ دیا تو اس میں کیا قباحت ہے؟

جعفری صاحب اپنے مکتوب میں جنگ صفین اور جنگ جمل کے حوالے سے لکھتے ہیں: ”تین بڑی ہستیوں کے اقدامات دانستہ کو خطائے اجتہادی کہہ کر سکوت اختیار کر لینا سوالوں کا حل نہیں۔ الحق مرٌّ۔ یہ معاملہ صرف عقیدت اور ارادت مندی کا نہیں ہے۔ یہ ہیرو پسندی ہے جس میں انداز رندانہ کا فقدان ہے“ (معارف اکتوبر ۲۲ء ص ۸۰۴)

جعفری صاحب کو معلوم ہے کہ ہر اجتہاد، دانستہ ہوتا ہے لیکن اس میں صواب اور خطا دونوں کا احتمال رہتا ہے۔ لہذا یہ خیال درست نہیں کہ اقدامات دانستہ کو خطائے اجتہادی نہیں کہا جا سکتا۔ بہ ہر حال حضرات صحابہؓ کے ساتھ اظہار عقیدت اور ارادت مندی کو غیر رندانہ ہیرو پسندی قرار دینا صحت مند انداز فکر نہیں ہے۔

جعفری صاحب نے اپنے مکتوب میں حضرت زید بن ارقمؓ کی یہ روایت جو اہل بیت کی منقبت میں ہے نقل کی ہے: وانا تارک فیکم الثقلین اَوَّ لہما کتاب اللہ، فیہ الھدیٰ والنور ، فخذوا بکتاب اللہ و استمسکوا بہ واہل بیتی اُذَکِّرُکُمْ اللہ فی اھل بیتی (رواہ مسلم)[1] (میں تمہارے درمیان دو عظیم چیزیں چھوڑتا ہوں، ایک خدا کی کتاب جس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ خدا کی کتاب کو مضبوطی کے

---

[1] مشکوٰۃ المصابیح الجزء الثالث۔ دار الفکر بیروت ص: ۳۶۹، حدیث نمبر ۶۱۴۰)، سیرت النبی جلد دوم طبع جدید ۱۹۹۷ء ص: ۱۷۷، ۱۷۸۔

ساتھ پکڑو، اور دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں، تمھیں اہل بیت کے بارے میں خدا کو یاد دلاتا ہوں)۔

مذکورہ روایت کے ساتھ جعفری صاحب نے براء بن عازب اور زید بن ارقم رضی اللہ عنہما کی یہ روایت بھی نقل کی ہے جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی منقبت میں ہے: اللہم من کنتُ مولاہ فعلی مولاہ، اللہم وال من والاہ وعاد من عاواہ رواہ احمد[۲] (الٰہی! میں جس کو محبوب ہوں علی بھی اس کو محبوب ہونا چاہیے، الٰہی! جو علی سے محبت رکھے تو بھی اس سے محبت رکھ اور جو علی سے عداوت رکھے تو بھی اس سے عداوت رکھ)۔

جعفری صاحب نے رسول اللہ ﷺ کے آخری خطبہ حجۃ الوداع سے دو روایتیں نقل کی ہیں۔ پہلی روایت امام مسلم کی ہے جو اہل بیت کی منقبت میں ہے اور دوسری روایت جو مسند امام احمد اور ترمذی میں ہے وہ حضرت علیؓ کی منقبت میں ہے۔ کیا دونوں روایتوں کو ایک ساتھ ذکر کرکے جعفری صاحب حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو افضل صحابہ ہونے کا تاثر دینا چاہتے ہیں؟ کیا اس انداز تحریر کا تعلق مخاصمتی لٹریچر سے نہیں ہے؟ جناب زاہد جعفری صاحب کے مکتوب کا چھٹا پیراگراف ژولید گی بیان کی نذر ہو کر رہ گیا ہے۔

زیر بحث شمارے میں جناب زاہد جعفری اور جناب خالد ندیم صاحبان کی غزلیں بہت عمدہ ہیں لیکن زاہد جعفری کی غزل کا مطلع:

میں تھا چپ، کیوں ترے لشکر کی زباں بیٹھ گئی ؟
دہشت خوں ، بہ دلِ دشمن جاں بیٹھ گئی

پڑھ کر حضرت نشور واحدی مرحوم (۱۹۱۲ء۔۱۹۸۳ء) کا یہ شعر یاد آگیا:

ساحلوں سے دور رہ کر موج دریا کیا نشور؟
شاعری مبہم ہے موزوں استعاروں کے بغیر

وارث ریاضی
مغربی چمپارن، بہار
۸۲۲۸۹۰۲۵۴۸

---

[۲] مشکوۃ المصابیح الجزء الثالث مطبوعہ دارالفکر بیروت ص: ۳۶۰۔ حدیث نمبر ۶۱۰۳ سیرت النبی جلد دوم ص: ۱۷۸

(۳)

علامہ شبلی کا ایک اور خط

مکتوبات شبلی کی دریافتوں کا سلسلہ ہنوز قائم ہے۔ گذشتہ سال ۲۰۲۱ء میں دارالمصنّفین سے ناچیز کی مرتبہ کتاب ''مکتوبات شبلی'' شائع ہوئی تھی جو علامہ شبلی کے ۱۳۷ متفرق اور نودریافت خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس کی اشاعت کے بعد مجلہ نقطہ نظر اسلام آباد کے شبلی نمبر (مدیر ڈاکٹر سفیر اختر) سے ۵ اور غیر مدون خطوط ہاتھ آئے جسے راقم نے ''افادات شبلی'' میں شامل کردیا ہے۔ ان خطوط کی اشاعت سے ''مکاتیب شبلی'' کی مجموعی تعداد ۱۲۲۷ ہوگئی تھی۔ حال میں علامہ شبلی کا ایک اور خط بنام مولوی قاضی عبدالرحمن حیرت اعظم گڑھی استاد نیشنل اسکول اعظم گڑھ ان کی تصنیف ''گلدستہ تہذیب'' حصہ دوم سے دستیاب ہوا ہے۔ یہ خط انہوں نے بطور نمونہ سر سید احمد خاں (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) کے خطوط کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس خط کی اشاعت سے علامہ شبلی کے مطبوعہ خطوط کی مجموعی تعداد اب ۱۲۲۸ ہوگئی ہے۔ نودریافت خط درج ذیل ہے :

''آپ کی تعلیم سے بہت لوگ مستفید ہو رہے ہیں، لیکن اب تک ہمارا خاندان محروم ہے۔ اس لئے عزیزی عارف کو آپ کے سپرد کرتا ہوں۔ اس کو تعلیم اور تعلیم سے زیادہ تربیت کی ضرورت ہے۔ براہ مہربانی خاص توجہ مبذول رکھئے گا''۔ والسلام

شبلی نعمانی ــــ ۲۲ جنوری ۱۹۰۶ء

(اپر پرائمری ریڈر گلدستہ تہذیب، حصہ دوم، ص۱۶۶)

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
azmi408@gmail.com

(۴)

دارالمصنفین میں محفوظ خطوط

نومبر کے شمارہ میں علامہ سید سلیمان ندوی کے نام چند خطوط شائع ہوئے ہیں، جو مولانا ریاست علی ندوی کے کاغذات میں ملے تھے۔ اس سلسلہ میں عرض یہ ہے کہ سید صباح الدین صاحب نے لکھا ہے کہ سید صاحب نے معارف کے لیے آنے والے سوالات کے جواب کی ذمہ داری مولانا ریاست علی ندوی کو سپرد کردی تھی جس کو وہ بہت اہتمام سے اور بحسن وخوبی انجام دیتے رہے، یہ مکاتیب بھی

بظاہر اسی سلسلہ کی کڑی ہیں اسی لیے ان کے کاغذات میں رہ گئے ہوں گے، ویسے قدیم شماروں میں یہ اور ان کا جواب تلاش کرنا چاہیے۔

دوسری گذارش یہ ہے کہ دارالمصنفین میں ابھی بہت سے خطوط ایسے باقی ہیں بالخصوص بیرون ہند کے فضلاء واہل علم کے جو منظر عام پر نہیں آسکے، اور اس طرح کے البم میں رکھے ہیں کہ نہ ان سے استفادہ ممکن ہے نہ پوری طرح ان کے تحفظ کی ضمانت ہے۔ آج کل تو ایسی فائلیں بآسانی دستیاب ہو جاتی ہیں جن میں رکھ دینے سے ان کو ہاتھ لگائے بغیر دونوں طرف کے صفحات کا مطالعہ بآسانی ممکن ہوتا ہے، اس کی اشد ضرورت ہے۔ امید ہے کہ آپ کے دور میں یہ کام ہو سکے گا۔ پہلے بھی اس کی طرف توجہ دلائی گئی تھی۔ مولانا یوسف بنوری اور مولانا حبیب الرحمن اعظمی کے خطوط کی اچھی تعداد ہے، اگر وہ بھی معارف میں شائع ہو جائیں تو بہتر ہوگا۔ خدابخش لائبریری جرنل میں ابھی لائبریری میں محفوظ مکاتیب کا ایک اجمالی تعارف واشاریہ شائع ہوا تھا۔ اسی طرح اگر معارف میں بھی ان محفوظ مکاتب کا اشاریہ و تعارف شائع ہو سکے تو بہتر ہوگا۔ ان مکاتیب کی ایک بڑی تعداد معارف میں شائع ہو چکی ہے لیکن اب بھی ایک حصہ منتظر اشاعت ہے۔

طلحہ نعمت ندوی
۹۱۱۷۳۹۴۷۶۶

(۵)

"تذکرۂ علماءِ اعظم گڑھ"

ہم سب کا موقر رسالہ معارف اکتوبر ۲۰۲۲ء ملا۔ سر مقالہ دیکھ کر ہی آپ کی بزم میں حاضر ہونے کا دل چاہا۔ "تذکرۂ علماءِ اعظم گڑھ" اپنے موضوع پر اولین اور بہترین کتاب ہونے کی وجہ سے حوالہ کی کتاب بھی ہے۔ اس لیے اس کے تسامحات کی نشاندہی بھی ضروری اور اہم ہے۔ جسے بہت حد تک پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی صاحب نے پوری بھی کی ہے۔ پھر بھی کچھ چیزیں رہ گئی ہیں، جن میں میرے جد اعلیٰ حضرت شاہ فتح قلندر کا حال بھی ہے جو کہ صفحات ۲۹۴تا۲۹۶ میں ہے (طبع جدید) اس میں کئی تسامحات ہیں جن کا ذکر مندرجہ ذیل ہے:

۱۔ نام فتح محمد کی جگہ فتح علی دیا ہے جو کہ صفحہ ۲۹۴ پر تین جگہ اور صفحہ ۲۹۵ پر ایک جگہ کے علاوہ شاہ فضل علی کے حال میں صفحہ ۲۹۸ اور ۲۹۹ پر دو جگہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ یہ سہو کتابت نہیں ہے۔

جب کہ شیخ عبدالقدوس نظام آبادی کے حال میں اصول المقصود، بحر ذخار، فصول مسعودیہ و انتصاح عن ذکر اہل الصلاح اور تجلی نور کا حوالہ دیا ہے، ان سب میں نام فتح محمد ہی دیا ہے۔

۲۔ ''داراشکوہ نے آپ کے لیے ایک خانقاہ اور مسجد بنوادی تھی''۔ مسجد تو بے شک بنوادی تھی مگر خانقاہ کسی نے کبھی بنوائی ہی نہیں۔

۳۔ آپ کی اولاد کے بارے میں ہے کہ ''ان لوگوں نے بھی مذہب تشیع اختیار کرلیا''۔ یہ بالکل کورا اتہام ہے۔ آپ کی اولاد میں سے ایک فرد نے کبھی بھی اس مذہب کو اختیار نہیں کیا نہ ہی پورے موضع قلندرپور میں کوئی شیعہ ہے۔

۴۔ حضرت شاہ فتح قلندر کے چاروں بیٹوں کا نام صفحہ ۲۹۵ پر ''شاہ بہاء اللہ، شاہ پیر محمد معروف بہ شاہ میرک (صحیح میرن) شاہ محمد واصل، شاہ علیم اللہ'' صحیح لکھا ہے مگر صفحہ ۲۹۸ پر ''شیخ محمد کامل خلف الرشید شیخ فتح علی قلندر'' دیا ہے۔ یہ دراصل شیخ محمد کامل خلف شاہ محمد واصل خلف الرشید شیخ فتح محمد قلندر ہیں''۔

یہ تسامحات طبع اول میں بھی ہیں بلکہ مزید کچھ کتابت کی بھی غلطیاں ہیں۔ اس نسخے کا میں نے دارالمصنّفین میں آج سے تقریباً ۴۰ سال قبل مطالعہ کیا تھا۔ امید ہے کہ معارف میں آجانے کے بعد علمی حلقہ میں یہ تسامحات پروان نہ چڑھیں گے۔

شاہ ظفرالیقین، گیاپور
۸۸۵۸۶۸۰۴۰۹

(۶)

شائع شدہ نظم میں غلطی کی اصلاح

معارف اگست ۲۰۲۲ کا شمارہ کچھ تاخیر سے مطالعے میں آسکا۔ اس شمارے میں میری ایک نظم بعنوان ''امام غزالی'' شائع ہوئی ہے۔ اس کے آخری شعر کا دوسرا مصرعہ غلط چھپ گیا ہے اور شعر ناموزوں ہوگیا ہے۔ اصل شعر اس طرح ہے:

آ کہ معنی کی نئی اک کہکشاں پیدا کریں
آ کہ خشتِ کہنہ سے، تازہ جہاں پیدا کریں

ڈاکٹر وارث مظہری، جامعہ ہمدرد، دہلی
wmmazhari@jamiahamdard.ac.in

رسید کتب موصولہ

آخری وقفے کا کھیل: مرتب، جناب محمد عمران قریشی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، صفحات ۲۸۷، سالِ اشاعت ۲۰۱۵ء، قیمت ۳۵۰ روپے۔

پاسدارِ علم و عمل ..... محمد حامد علی: مرتب، ضمیر احمد پیام، گلفشاں منزل، محلہ قاضی پور خورد، گورکھپور (یوپی) صفحات ۱۹۴۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۲۰۰ روپے۔

ترجمان القرآن الکریم و تفہیم القرآن العظیم (سورۃ البقرۃ): ترجمہ و تفسیر، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ترتیب وتدوین جناب احمد ابوسعید، شان پبلی کیشنز، طاہر ولا، یوسف گوڑہ، حیدرآباد، صفحات ۱۲۳۲، سال اشاعت ۲۰۲۱ء، ہدیہ: ۷۰۰ روپے۔

سوز دروں: ڈاکٹر اختر ریاض، ڈی، کمار اینڈ کمپنی، لکشمن بازار، الٰہ آباد، صفحات، ۱۴۴ سال اشاعت ۲۰۰۸ء قیمت ۱۰۰ روپے۔

سہیل واسطی (مونوگراف): جناب محمد عمران قریشی، مغربی بنگال اردو اکیڈمی، کولکاتا۔ صفحات ۲۰۸۔ سال اشاعت ۲۰۲۱ء، قیمت ۱۳۰ روپے۔

عالمی تہذیب کو اسلام کا عطیہ: ڈاکٹر محمد انوار الحق تبسم، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس۔، نئ دہلی، صفحات ۱۷۶۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۲۷۵ روپے۔

کاکو کی کہانی الما کی زبانی: جناب الماطیف شمسی (علیگ) بک امپوریم سبزی باغ، پٹنہ (بہار)، صفحات ۲۹۶۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۳۵۰ روپے۔

مخ المعانی (ملفوظات شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیریؒ): جامع زین بدر عربی، خانقاہِ منعمیہ، میتن گھاٹ، پٹنہ سیٹی، (بہار)۔ صفحات ۳۹۶۔ سال اشاعت ۲۰۲۰ء، قیمت: ۴۰۰ روپے۔

مقاصدِ شریعت۔ ایک مطالعہ: مولانا محمد صابر حسین ندوی، جامعہ ضیاء العلوم کنڈلور، کرناٹک۔ صفحات ۱۳۶۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء، قیمت ۱۵۰ روپے۔

یادایام: مولانا محمد اسحاق، آزاد کتاب گھر، نوح، میوات (ہریانہ) صفحات ۴۵۰۔ سال اشاعت ۲۰۱۷ء، قیمت: ۳۰۰ روپے۔

مضمون نگاروں کے لئے اعلان

۱۔ مضمون صرف ورڈ MS Word پروگرام میں، جمیل نوری نستعلیق فانٹ، پوائنٹ ۱۵ میں بذریعہ ایمیل بھیجیں۔ ایمیل کا پتہ: info@shibliacademy.org

۲۔ اگر مضمون مخطوطہ حالت میں دستی یا ڈاک سے بھیجا جارہا ہے تو براہ کرم کاغذ کے صرف ایک طرف اچھا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں اور مضمون کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔

۳۔ ہر صفحے کے حوالہ جات اسی صفحے پر نیچے حاشیے پر نمبر وار لکھیں۔

۴۔ آسان اور عام فہم زبان استعمال کریں۔

۵۔ حوالے اس ترتیب سے ہوں: مصنف، کتاب کا نام، ناشر، جگہ، سال، جلد (اگر ایک سے زیادہ جلد ہو)، ایڈیشن (اگر طبع اول کے بعد کا ایڈیشن ہو)، صفحہ، صفحات۔

۶۔ مضمون A4 سائز کے ۶۔۲۰ صفحات کے درمیان ہو اور ہر مضمون اپنی جگہ مکمل ہو۔

۷۔ معارف میں حتی الامکان سلسلہ وار مضامین نہیں شائع کئے جائیں گے۔

۸۔ معارف میں صرف غیر مطبوعہ مضامین و مقالات کو جگہ دی جائے گی۔ کہیں اور چھپنے کے لئے بھیجا گیا مضمون قابل قبول نہیں ہوگا۔

۹۔ نئے مضمون نگار اپنے مضامین کو معارف بھیجنے سے پہلے اپنے اساتذہ یا معتبر اہل علم کو دکھالیں۔

۱۰۔ نئے مضمون نگار اپنے مضمون کے ساتھ اپنی مختصر کوائف نیز پورا پتہ بشمول موبائل اور ایمیل پتہ بھی بھیجیں۔

۱۱۔ ہر مقالے کے ساتھ یہ وضاحت ہو کہ یہ مقالہ پہلے کہیں نہیں چھپا ہے اور اسے چھپنے کے لئے کہیں اور نہیں بھیجا جارہا ہے۔

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت	کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2800/-	اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر	100/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-	سفر نامہ روم و مصر و شام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات فارسی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	300/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعر العجم (اول)	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعر العجم (دوم)	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعر العجم (سوم)	125/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعر العجم (چہارم)	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعر العجم (پنجم)	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	150/-
مکاتیب شبلی (اول)	150/-	الندوہ (۹ جلدیں)	4735/-
مکاتیب شبلی (دوم)	190/-	اسلام اور مستشرقین (چہارم)	250/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-	الکلام	250/-
		علم الکلام	200/-
خطبات شبلی	150/-	انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-

ISSN 0974-7346 Ma'arif (Urdu) Print DEC 2022 Vol. 209/12

RNI No. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/022

Monthly Journal of
DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O. Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P., India
Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنّفین کی چند اہم مطبوعات

سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندویؒ	100/-
مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	250/-
مطالعات شبلی	,, ,,	550/-
حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	600/-
شبلی کی آپ بیتی	مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
امام رازی	مولانا عبدالسلام ندویؒ	320/-
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	600/-
تذکرۃ المحدثین (اول)	مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ	200/-
تذکرۃ المحدثین (دوم)	,, ,,	225/-
تذکرۃ المحدثین (سوم)	,, ,,	300/-
محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمنؒ	120/-
مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ	240/-
ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلیؒ	330/-
تاریخ اسلام (اول و دوم مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	375/-
تاریخ اسلام (سوم و چہارم مجلد)	,, ,,	500/-
تاریخ صقلیہ اول	سید ریاست علی ندویؒ	400/-
تاریخ صقلیہ دوم	,, ,,	400/-
اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمن	250/-
یہود اور قرآن	مولانا ضیاءالدین اصلاحیؒ	150/-
تاریخ ارض القرآن	مولانا سید سلیمان ندویؒ	375/-